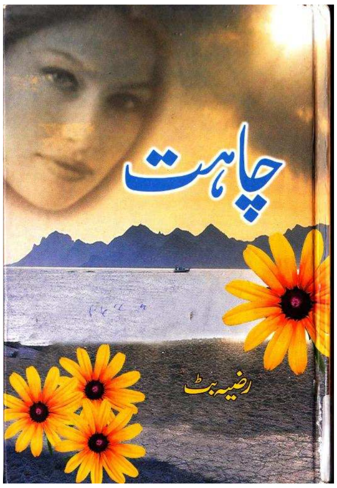

"تم شریک ہو گئے۔"
"مشکل ہی ہے۔"
"کیوں؟انوی ٹیشن تو تمہیں بھی ملا ہے۔"
"ملا تو سب کو ہے۔"
"پھر کیا بات ہے، مفت میں اتنا شاندار ڈنر۔"
"وہ تو ہے۔"
"ہلٹن میں ڈنر کھانے کا کبھی تصور بھی کیا ہے واہ وا..... کیا کہنے۔ میں تو اس پراسرار سی عمارت کو روز گزرتے ہوئے حسرت سے تکا کرتا ہوں۔"
"ہوں۔"
"تمہارے تذبذب کو میں سمجھ نہیں سکا۔"
"بھئی جانا مفت تھوڑا ہی ہو گا۔"
"تو اور کیا، تحفے تحائف کا سلسلہ بھی ہے۔"
"ظاہر ہے۔"
"جانے دو یار۔ اتنے لوگوں میں ہمیں کون دیکھے گا کہ کیا لائے، کیا نہیں۔"
"پھر بھی۔ نور احمد صاحب کی صاحبزادی کی صحت یابی کا جشن ہے۔ ہمیں کچھ تو لے جانا ہی پڑے گا ارشد میاں۔"
"دیکھیں گے۔ دفتر کے تینوں افسروں اور ہم چاروں کلرکوں کو دعوت نامہ ملا ہے۔ جو کچھ اور دیں گے، ہم بھی اسی کے برابر برابر کوئی چیز لے لیں گے۔"

"مثلاً؟"
"مثلاً۔ مثلاً۔"
جاوید کھلکھلا کر ہنس پڑا۔ دونوں دوست کینٹین میں بیٹھے چائے پی رہے تھے۔ آج فرم کے مالک نور احمد کی طرف سے انہیں دعوتی کارڈ ملا تھا۔ ان کی اکلوتی بیٹی نورینہ کی صحت یابی کی خوشی میں ہلٹن میں ڈنر دیا جا رہا تھا۔ وہ کیا بیمار تھی۔ تفصیل تو دونوں کو پتہ نہ تھی۔ ہاں دفتر میں ایک ماہ پہلے کچھ چرچے سنے تھے۔
"نور احمد صاحب کی بیٹی ہسپتال میں داخل ہے۔"
"اس کا ذہنی توازن بگڑ گیا ہے۔"
"حادثہ بھی جانکاہ تھا۔"
"ہاں اس کا منگیتر اس حادثے میں موقع پر ہی ہلاک ہو گیا۔ دونوں لمبی ڈرائیو کے بعد گھر واپس آ رہے تھے کہ ٹرک سے گاڑی ٹکرا گئی۔"
"یہ تو کئی ماہ پہلے کی بات ہے۔"
"نورینہ نے اس بات سے بڑا اثر لیا۔ دو ماہ سے وہ بیمار ہے۔ گھر پر علاج معالجہ ہوتا رہا۔ اب ہسپتال داخل کروا دی گئی ہے۔"
ایسی باتیں سننے میں آتی رہی تھیں۔ دفتر کے اس عملے کا تعلق چونکہ نور احمد کی ذاتی نوعیت کا تھا۔ نہ سٹیٹس کے لیول کا، اس لیے یہ لوگ سنی کو اَن سنی کر دیتے تھے۔ لمحہ بھر کی ہمدردی ضرور ہوتی، پھر اپنی ذاتوں میں اُلجھ جاتے تھے۔ حادثہ تو بے شک بڑا بے رحم ہوا تھا لیکن صاحبزادی کا اس حد تک اثر لینا اور ہسپتالوں میں ایڈمٹ ہو کر علاج معالجہ کروانا ان لوگوں کی دانست میں دولت کے چونچلوں کے سوا کچھ نہیں تھا۔
جاوید، ارشد، جمیل اور ہمایوں دفتری عملے کے آدمی تھے۔ چاروں کلرکی کرتے تھے۔ اپنے مسائل، اپنے غم اور اپنی خوشیاں تھیں۔ ان اونچے لوگوں سے دُور ہی کا واسطہ تھا۔ کام کرتے تھے، تنخواہ لیتے تھے اور اس تنخواہ میں کبھی نہ بن سکنے والے بجٹ ہی کے رونے رویا کرتے تھے۔
ارشد شادی شدہ نہ تھا لیکن بیمار باپ، بوڑھی ماں اور تین جوان بہنوں کی

شادی کا بوجھ سر پر تھا۔ بڑے دونوں بھائی اپنی بیویوں سمیت الگ ہو چکے تھے۔ بڑی بہن استانی تھی۔ دونوں مل کر گھر کی گاڑی کھینچ رہے تھے۔ بہن کے بالوں کی سیاہی اور چمک معدوم ہوتی جا رہی تھی اور چہرے پر حقائق کی تلخی نے سختی پیدا کر دی تھی۔ اپنے ہی غم بہت تھے۔ نور احمد کی بیٹی کی بیماری سے اسے کیا دلچسپی ہو سکتی تھی۔ ہمایوں بھی کچھ ایسے ہی حالات سے دوچار تھا اور یہی حال جمیل کا تھا۔ اس کے سر پر ارشد کی سی ذمہ داریاں تو نہ تھیں لیکن گھر میں فراغت بھی نہیں تھی۔ بمشکل باپ بیٹے کی آمدنی سے سفید پوش کا بھرم رکھا جاتا تھا۔ گھر اپنا تھا، اس لئے اس طرف سے اطمینان تھا۔ شادی نہ ہوئی تھی، یہ بھی اس کے لئے جیسے اک نعمت تھی۔
جاوید کا معاملہ بھی ویسا ہی تھا۔ گو ماں باپ یا بھائی بہنوں کی ذمہ داری نہ تھی۔ باپ عرصہ ہوا فوت ہو گیا تھا۔ ماں پچھلے سال اللہ کو پیاری ہوئی تھی۔ دونوں بہنوں کی شادی ہو چکی تھی۔ بڑی بہن کچھ کھاتے پیتے گھر میں گئی تھی۔ چھوٹی کا میاں جاوید ہی کی طرح کسی پرائیویٹ فرم میں کلرک تھا۔
دو بھائی خوش حال نہیں تھے۔ پھر بھی اپنے اپنے بچوں اور بیویوں کی ذمہ داری اٹھائے زندگی کا بوجھ گھسیٹ رہے تھے۔
جاوید کی شادی پانچ چھ سال پہلے ایک میٹرک پاس دوشیزہ سے ہوئی تھی۔ فاخرہ شکل و صورت کی اچھی تھی۔ ویسے بھی سمجھدار لڑکی تھی۔ والدین غریب تھے۔ جاوید جیسا خوبرو جوان جو برسرِ روزگار بھی تھا، ان کے لیے فرشتۂ رحمت تھا۔
جاوید کا اپنا گھر نہیں تھا۔ نہ ہی ورثے میں کوئی ٹوٹی پھوٹی کوٹھری میسر آئی تھی۔ پرانا سا گھر ماں نے حالات سے نبرد آزما ہونے کے لیے بیچا تھا۔ اب جاوید اپنی بیوی اور پھول ایسی بچی کے ساتھ کرائے کے اک کوارٹر نما گھر میں رہ رہا تھا۔
میاں بیوی کے درمیان خلوص و محبت اور اعتماد کا رشتہ مضبوط و مستحکم تھا۔ سلیقہ اور کفایت شعاری مزاجوں میں رچی بسی تھی۔ چھوٹا سا دو کمروں، برآمدے اور کچے صحن والا گھر دونوں کی جنت تھا۔ قلیل آمدنی اس جنت کی بہاروں پر کبھی اثر انداز نہ ہوئی تھی کہ فاخرہ نے حالات سے سمجھوتہ کرنے کی تربیت شروع ہی سے پائی تھی۔ خدا

نے خوبصورت جوان مرد کی بانہوں کا سہارا دیا تھا اور شادی کے سال بھر بعد ہی چاند ایسی بچی دے کر مسرتوں میں اضافہ کیا تھا۔ بچی کو دیکھ دیکھ کر دونوں پھولے نہ سماتے تھے۔ اس نے نقوش باپ سے لیے تھے اور شہابی سندوری رنگت ماں سے پائی تھی۔ بڑی صحت مند اور بے حد پیاری بچی تھی۔

جاوید کو تو بچی سے مجنونانہ حد تک پیار تھا۔ اس کی پیدائش سے پہلے ہی اس نے فاخرہ کے کان میں محبت سے سرگوشی کی تھی۔ "تمہیں شاید بیٹے کی خواہش ہو لیکن پہل میری ہے۔ مجھے پیاری پیاری موٹی تازی ہنستی مسکراتی بیٹی چاہیے۔"

فاخرہ شرم وحیا سے سرخ ہو کر بولی تھی۔ "مجھے کیا پتہ کیا ہو گا۔"

"میں دعا کرتا رہتا ہوں۔"

"خدا کرے آپ کی دعا پوری ہو جائے۔"

اس کی دعا پوری ہو گئی تھی...... اس کی خواہش کا بھرم خدا نے رکھ لیا تھا اور آٹھ پاؤنڈ کی صحت مند بچی جس کے بال ریشم کی طرح ملائم اور رات کی تاریکی کی طرح سیاہ تھے، جس کی آنکھیں بڑی بڑی تھیں اور لمبی کالی پلکیں گلابی گالوں تک سایہ فگن ہوئی تھیں، جس کے ہونٹوں پر شاید پیدائشی مسکراہٹ تھی، جاوید کے بازوؤں میں آ گئی۔

وہ کتنا خوش تھا، اس کا اظہار نہیں کر پاتا تھا۔ وہ جانے کہاں سے پیسوں کی کانٹ چھانٹ کر کر کے بچی کے لیے خوش رنگ فراک اور پیارے پیارے کھلونے لایا کرتا تھا۔ پہلے وہ سگریٹ پیتا تھا۔ اب بالکل بند کر دیئے تھے۔ محدود آمدنی کو وہ اسی طرح ہی تو ایڈجسٹ کر سکتا تھا۔

فاخرہ اس کے ذاتی خرچ کی اس کانٹ چھانٹ پر بگڑ جاتی۔ "آپ ایسا کیوں کرتے ہیں۔ بچی کو ان چیزوں کا عادی نہ بنائیں۔"

وہ بچی کو سینے سے چمٹا کر کہتا۔ "تم جلتی ہو نا...... لیکن میں کہہ دوں کہ تم سے بھی مجھے اب تک وہی پیار ہے۔"

وہ مسکرا دیتی۔ جلنے کا کیا سوال تھا۔ بچی تو اس کی بھی جان تھی۔ اس کے دم سے تو گھر میں جیسے فردوسی رعنائیاں اتر آئی تھیں۔ بہاریں ہی بہاریں مسکراتی

...یں...... اسے بھی بچی سے بہت پیار تھا۔

اس نے خود بھی تو اخراجات میں کفایت کر دی تھی۔ چائے کی شوقین تھی ...پتی، دودھ اور چینی کا خرچہ کم کر کے کچھ پیسے تو بے بی کے لیے بچ جاتے تھے۔

وقت گزر رہا تھا۔ دونوں میاں بیوی ایک دوسرے سے چھپا چھپا کر پیسے بچاتے ...اور بے بی کے لیے چیزیں خریدتے تھے۔ دونوں بچی کے دیوانے تھے۔

آج اسے فرم کے مالک کی طرف سے دعوت نامہ ملا تو وہ اسی لیے ادھیڑ بن میں ...یا تھا۔ ارشد جانے پر بضد تھا اور وہ ٹال مٹول کر رہا تھا کہ چالیس پچاس روپے کا تحفہ ...دینا پڑا تو یہ بے بی کی حق تلفی ہو گی۔ اب تو وہ چار سال کی ہو رہی تھی اور فرمائش ...نے کی بھی عادی تھی۔

لیکن ارشد نے اسے دلیلیں دے کر قائل کر ہی لیا۔ "اتنے لوگوں کے ...لف ہوں گے۔ ہم بھی کوئی چھوٹی موٹی چیز دے دیں گے۔"

اور

پھر خود ہی اسے ایک بات سوجھی۔ "سنو جاوید۔"

"ہوں۔"

"یوں کرتے ہیں کہ ہم چاروں پیسے ڈال کر کوئی چیز خرید لیتے ہیں۔"

"ٹھیک...... بالکل ٹھیک۔ پندرہ پندرہ، بیس بیس روپے ڈال لیتے ہیں۔ جمیل ...ر ہمایوں بھی رضامند ہو جائیں گے۔"

"یہ رہی نا بات۔"

"سانپ بھی مرے لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔"

"بالکل...... بالکل...... ہلٹن میں ایسی گیدرنگ میں ہم لوگ جانے کا کبھی ...وچ بھی سکتے ہیں...... مزہ رہے گا...... ذرا کی ذرا دیر اونچے لوگوں میں ہم بھی شامل ہو ...جائیں گے......"

جاوید ہنس پڑا...... چائے پی کر دونوں اٹھ کھڑے ہوئے۔

"بات کیا ہے؟" فاخرہ نے پوچھا تو جاوید مسکراتے ہوئے بولا۔ "بھلی لوگ۔ ڈنر پر مدعو ہوں۔ اس لیے کہہ رہا ہوں کہ شادی والا اکلوتا سوٹ نکال کر استری کر دو......"

فاخرہ نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔ "کس نے ڈنر پر بلایا؟"

"فرم کے مالک نے۔"

"اوہ اچھا۔"

فاخرہ خوشی اور تفاخر کے احساس سے پھول کر اترائی۔

"نور احمد صاحب نے بلایا ہے؟"

"ہاں۔"

"گھر پہ؟"

"نہیں ہلٹن میں۔"

"مزے ہیں......" پھر مسکرا کر بولی۔ "صرف آپ ہی کو بلایا ہے، مجھے نہیں؟"

"جی نہیں محترمہ۔ صرف سٹاف کو دعوت دی ہے، مجھے مخصوص دعوت نہیں ملی۔"

"اللہ آپ تو ایسے چڑچڑے ہو رہے ہیں۔"

"بیس پچیس روپے خوامخواہ ضائع ہوں گے۔"

جاوید نے تحفہ دینے کی تجویز اس کے گوش گزار کی تو وہ ہنس کر بولی۔ "ایسی کنجوسی بھی کیا...... پھر آپ نے فرم کے مالک کی دعوت پر جانا ہے۔ سو پچاس خرچ ہو بھی جاتے تو کیا تھا...... مالک کی نظروں میں آ جاتے......"

"رہنے دو...... ہم ایسے ہی بھلے...... دولت مندوں کے چونچلے ہیں سب...... مجھے تو ارشد نے مجبور کیا تھا ورنہ جاتا ہی نہیں......"

"جانا تو ضرور چاہیے تھا۔" فاخرہ بولی۔

"بے بی کہاں ہے؟ چھوڑو ان باتوں کو۔" جاوید نے بچی کو پکارا۔

"سو رہی ہے، آہستہ بولیے۔" فاخرہ نے کہا۔ جاوید برآمدے سے کمرے میں

آ گیا۔ بستر میں وہ بے خبر سو رہی تھی۔ اس نے آہستہ سے جھک کر بچی کی پیشانی چوم لی۔

فاخرہ نے بکس میں تہہ کر کے رکھا گرم نیوی بلو سوٹ نکالا۔ یہ سوٹ جاوید کبھی کبھار خاندان میں شادی کے موقعوں پر پہنا کرتا تھا۔

فاخرہ نے سوٹ پلنگ پر پھیلا کر کہا۔ "ہائے یہ فیشن تو اب پرانا ہو چلا۔ اب تو اتنے بڑے بڑے کالر کوئی نہیں پہنتا اور پتلون کی موری بھی......"

"چلو رہنے دو۔ میں کون سا فیشن شو میں جا رہا ہوں۔ فرم کے مالک کا بلاوا ہے ورنہ جانے کو کس کافر کا جی چاہ رہا تھا۔"

"اس کے ساتھ ٹائی......"

"دو پڑی تھیں۔"

"سرخ پھولوں والی نیلی۔"

"یہی ٹھیک ہے......"

"اور قمیض؟"

"کریم کلر ہے نا۔"

"پرانی ہے۔"

"کیا ہوا، بس ٹھیک طرح سے پریس کر دو۔"

فاخرہ نے بڑی محنت سے سوٹ استری کیا۔ جوتوں پر پالش لگائی۔ رومال، جرابیں اور ٹائی بھی استری کر کے رکھی۔ قمیض کالر کے قریب سے گھسی تھی، اسے رفو کر دیا۔

جاوید نے نہا دھو کر کپڑے پہنے...... اور شیشے کے سامنے اپنا چہرہ مختلف زاویوں سے دیکھتے ہوئے بال بنانے لگا۔ فاخرہ اس کی پشت پر کھڑی مسکرا رہی تھی۔

"کیا ٹھاٹھ ہیں ہمارے؟" وہ مسکرایا۔

"پرانے کپڑوں میں بھی شہزادے لگ رہے ہیں۔"

"پرانے رئیس ہیں جناب۔"

"بالکل۔" اس نے پیار سے اسے دیکھا...... جاوید نے شوخی سے جھک کر اس

کو پیار کر لیا۔

"اللہ" وہ شرما گئی...... جاوید کو اس پر بے طرح پیار آنے لگا۔

"اب جائیے بھی......" فاخرہ اس کے بازوؤں سے اپنا آپ چھڑاتے ہوئے بولی۔

"جا رہا ہوں۔"

"سائیکل پر جائیں گے؟"

"نہیں موٹر پر......"

"کس کی موٹر پر......؟"

"بھلی لوگ سائیکل کے سوا اور کس پر جاؤں گا؟"

"ہائے نہیں رکشے پر چلے جائیے۔ ہلٹن جا رہے ہیں اور سائیکل پر......"

فاخرہ کے اصرار پر اس نے رکشے کے پیسے خرچ کرنے کا کڑوا گھونٹ بھر لیا۔ بیوی اور بچی کو پیار کیا اور گھر سے باہر آ گیا۔

دھیمی دھیمی پراسراری روشنیوں میں لوگوں سے بھرا ہال آہستگی اور شائستگی سے باتیں، دبے دبے قہقہوں میں خوشی و مسرت کا اظہار، پلیٹوں اور چمچوں کی کھنک کھانے کی اشتہا آمیز خوشبو اور چاق و چوبند وردی پوش بیروں کا حسن کارکردگی ہلکے ہلکے میوزک کی لہروں کے سنگ بے حد بھلا لگ رہا تھا۔ شہر کے چوٹی کے لوگ آئے تھے۔ بہترین لباسوں اور بہترین پرفیومز استعمال کی ہوئی تھیں۔ ایئر کنڈیشنڈ ہال میں کھانے کی خوشبو اور پرفیومز کی مہک مل کر سانسوں کے ذریعے انسانی وجودوں میں اتر رہی تھی۔ سیلف سروس تھی۔ لوگ کھانا پلیٹوں میں لے لے کر ٹولیوں کی صورت کھڑے کھا رہے تھے۔

نور احمد صاحب خود بھی ہر مہمان کے پاس جا رہے تھے۔ ان کی صاحبزادی بھی لوگوں میں بٹ رہی تھی۔ خوبصورت پلین ساڑھی میں اس کا خوبصورت سراپا نکھرا نکھرا تھا۔ وہ بلاشبہ حسین لڑکیوں میں شمار ہو سکتی تھی۔ اس کے چہرے پر ہر چند کہ تازگی اور بشاشت نہ تھی۔ پھر بھی بڑی پُرکشش اور جاذب نظر تھی۔

جاوید، ارشد، جمیل اور ہمایوں کا اپنا ہی گروپ تھا۔ وہ لوگوں کی طرح بے باکی اور بے تکلفی سے پلیٹیں اٹھائے ہال میں کبھی ادھر اور کبھی ادھر بھی نہ جا رہے تھے۔ ارشد اور ہمایوں کا تو پہلا موقع تھا۔ جاوید ایک دفعہ یہاں پہلے بھی آ چکا تھا اور جمیل تو کبھی کبھی چائے یا کھانا یہاں دوستوں کے ساتھ کھا لیا کرتا تھا۔ پھر بھی چاروں جھکے جھکے کھڑے تھے۔ زیادہ ہنس بول بھی نہ رہے تھے۔ یہ احساس تھا کہ کوئی حرکت یا بات خلاف تہذیب سرزد نہ ہو جائے...... چاروں نے کھانا بھی ٹھیک طرح سے نہ کھایا اور پلیٹیں رکھ دیں۔ نور احمد ان چاروں کی طرف بھی آئے۔ "ہیلو...... آپ لوگ آئے ہیں، شکریہ۔

کچھ کھائیں پئیں......"

وہ ہنس ہنس کر کہہ رہے تھے۔ دفتر والے نور احمد صاحب اور ہلٹن والے ہال والے اس نور احمد میں زمین و آسمان کا فرق تھا۔

"آؤ بھئی کھاؤ پیو...... چلو میٹھا لے لو۔ ہر قسم کی ڈش پڑی ہے۔" نور احمد نے انہیں کھانے کی طرف لے جاتے ہوئے کہا۔

نورینہ اپنے دو تین ملنے والوں کے ساتھ کھڑی تھی۔ نور احمد کو اپنی کسی دوست سے ملانا تھا۔

"ڈیڈی۔" وہ انہیں دیکھ کر بولی۔

"جی بیٹے۔" نور احمد نے کہا۔ لیکن بیٹے جی تو آنکھیں پوری کی پوری کھولے جاوید کو تکے جا رہے تھے۔ یوں جیسے کوئی مافوق الفطرت چیز دیکھ لی ہو۔

جاوید سٹپٹا گیا۔ اس کا چہرہ سرخ ہو گیا۔

"ڈیڈی......" نورینہ نے باپ کا کندھا پکڑ لیا۔ اس کا وجود ہولے ہولے کانپ رہا تھا۔

"کیوں بیٹے۔" نور احمد نے بیٹی کی نظروں کا تعاقب کیا۔

"اسلم......" نورینہ نے جاوید کی طرف اشارہ کیا۔ وہ اب بھی آنکھیں پھیلائے اسے تکے جا رہی تھی۔ اس کی سہیلیاں بھی اس کی پشت پر کھڑی تھیں۔ وہ بھی جاوید کو دیکھنے لگیں۔

نور احمد نے بیٹی کو تھپتھپایا۔ "بیٹے یہ میرے آفس کے آدمی ہیں، ان کا نام جاوید ہے۔"

اس نے بے یقینی سے سر نفی میں ہلایا۔

"ویسے معاف کیجئے گا جاوید صاحب۔ آپ کی مشابہت اسلم سے بہت زیادہ ہے۔ اس لباس میں اس وقت تو واقعی آپ......"

نورینہ باپ سے ہاتھ چھڑا کر جاوید کی طرف آئی۔ اس کو سر تا پا غور سے دیکھا۔

جاوید شرم سے سرخ ہوا جا رہا تھا۔ بہت سے لوگ ان کے گرد جمع ہو گئے تھے۔

"آپ اسلم کے بھائی ہیں؟" نورینہ نے براہِ راست جاوید سے سوال کیا۔

جاوید نے نفی میں سر ہلایا۔ نورینہ کی آنکھیں حیرت سے اور پھیل گئیں۔

"کوئی اور رشتہ داری؟"

"نہیں......"

"او خدایا۔"

حیرت سے پھیلی آنکھیں بند ہونے لگیں۔ نور احمد نے لپک کر بیٹی کو تھام لیا...... وہ شاید گرنے کو تھی۔

نورینہ کی ممی بھی ادھر آ گئی۔ ایک لمحے کو اس نے بھی جاوید کو حیرت سے دیکھا۔

"آپ کس قدر اسلم سے ملتے ہیں...... نورینہ کو اس مشابہت سے حیرانگی ہوئی ہے۔"

وہ اپنی بیٹی کی طرف مڑی...... وہ ہوش میں ہی تھی لیکن کچھ نقاہت محسوس کرنے لگی تھی۔

اس کی ممی اور دو تین سہیلیاں اسے ہجوم سے نکال کر لے گئیں۔ جاتے سمے بھی وہ مڑ مڑ کر جاوید کو دیکھ رہی تھی۔

رات بڑی سرد اور تاریک تھی۔ ڈنر کے خاتمے سے پہلے ہی جاوید ہال سے باہر نکل آیا تھا۔ نورینہ کی حرکت سے وہ بہت سے لوگوں کی نظر میں آ گیا تھا۔ وہ اپنی ذات کو موضوع بنا دیکھ کر کچھ ندامت، کچھ جھجک اور کچھ شرمساری کی کیفیت محسوس کرنے لگا تھا۔ اسی لئے لوگوں سے تو کیا اپنے گروپ کے لوگوں کی نظروں سے بھی بچ کر باہر آ گیا تھا۔ وسیع اور طویل برآمدے میں آ کر اس نے سردی کی کپکپی محسوس کی۔ ایک نظر اس نے اپنے پیچھے بند ہونے والے شیشے کے داخلی دروازے پر ڈالی جہاں مغلیہ دور کی یاد تازہ کرنے والے دربان کھڑے تھے۔ وہ ایک دم وہاں سے ہٹ گیا۔ باہر نکلا، ہوٹل کے احاطے میں لان کے بیرونی طرف اور برآمدوں کے آگے کاریں کھڑی تھیں۔ لمبی لمبی چمکیلی کاریں...... جو باہر کی غبار آلود روشنی میں بھی چمک رہی تھیں۔

جاوید درمیانی سڑک پر ہوتے ہوئے باہر پھاٹک کی طرف جانے لگا۔ جانے کیوں اسے احساس ہو رہا تھا کہ وہ غلط جگہ پر آ گیا تھا......

بڑے گیٹ سے باہر نکل کر سڑک پر آہستہ آہستہ چلتے ہوئے وہ آج رونما ہونے والے واقعے کے متعلق سوچنے لگا۔

"کیا کبھی کسی غیر سے اتنی بھی مشابہت ہو سکتی ہے کہ نظریں دھوکہ کھا جائیں۔" اس نے سوچا...... ایسا مشاہدہ اس نے تو کبھی نہیں کیا تھا......

پھر اسے خیال آیا کہ نورینہ اپنے منگیتر کی حادثاتی موت سے اتنی متاثر ہوئی تھی کہ کئی ماہ ذہنی توازن قائم نہ رہا۔ شاید اب بھی توازن کی کوئی کڑی ڈھیلی ہو۔

مسکراہٹ آپوں آپ اس کے لبوں پر آ گئی۔

سرد رات اور تاریک ہوتی جا رہی تھی۔ خون منجمد کر دینے والی ہوائیں چل رہی تھیں۔ سڑکیں تقریباً سنسان تھیں۔ کبھی کوئی گاڑی زن سے قریب سے گزر جاتی اور دور کہیں سے کتوں کے بھونکنے کی آواز آتی۔

بجلی کے کھمبے کے نیچے رک کر اس نے کوٹ آستین کھینچی بازو روشنی میں لاتے ہوئے گھڑی پر نگاہ ڈالی۔ گیارہ بجنے والے تھے۔ جاوید جس کے گھر میں سرِ شام ہی رات اتر آتی تھی اور جو اپنی محبوب بیوی اور عزیز بچی کے ساتھ نو بجے سے پہلے ہی بستر میں گھس جایا کرتا تھا، گیارہ بجے رات کافی دیر تھی۔

اسے فاخرہ کا خیال آ گیا۔ وہ اکیلی تھی اور یقیناً اس کے انتظار میں جاگ رہی تھی۔ ہو سکتا ہے ڈر بھی رہی ہو۔ اتنی رات گئے تک وہ کبھی اس گھر میں اکیلی نہ رہی تھی۔

اس کے قدم تیزی سے اٹھنے لگے۔ مال عبور کر کے وہ ذیلی سڑک پر اتر گیا...... اور پھر اپنے گھر کی طرف جانے والی سڑک پر ہو لیا۔ یہاں زندگی ابھی بیدار تھی۔ من چلے نوجوان کسی کسی دکان پر بیٹھے خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ بیڑی اور پان کھاتے چوکوں میں جمگھٹوں کی صورت میں کھڑے تھے۔ مال پر چھایا سکوت یہاں درہم برہم تھا۔

وہ تیز تیز قدم اٹھائے جا رہا تھا۔ فاخرہ کی تنہائی کے خیال سے پریشان بھی تھا۔ جی تو چاہا یہاں سے رکشہ لے لے اور جلدی گھر پہنچ جائے لیکن پھر اس خیال کو ذہن سے نکال دیا۔ اتنا رستہ تو اس نے پیدل چل کر طے کر لیا تھا۔ اب تھوڑی دور ہی جانا تھا خوامخواہ پیسے ضائع نہیں کرنا چاہتا تھا۔ رات کے سمے یہاں سے بھی تو رکشے والا اتنے پیسے مانگے گا کہ اسے سُن کر جھرجھری سی آ جائے گی۔

اس نے کوٹ کے کالر اٹھا کر گردن کو ڈھانپ لیا تھا اور دونوں ہاتھ سردی سے بچنے کے لیے کوٹ کی جیبوں میں ڈال لیے تھے۔ ایک جیب اندر سے ادھڑی یا پھٹی تھی۔ اس کی انگلیاں بار بار اس سوراخ میں گھس جاتیں...... اس نے غیر شعوری طور پر کئی بار باہر سے جیب پر نگاہ ڈالی تھی۔ باہر سے جیب سلامت تھی۔

اسے اپنی اوقات اور آج کے ڈنر کا سوچ کر ہنسی بھی آ رہی تھی۔ کیسے کیسے جغادری لوگ آئے ہوئے تھے۔ کیا شاندار سوٹ پہنے تھے مردوں نے...... عورتوں کی طرف تو اس نے زیادہ دھیان ہی نہیں دیا تھا۔ پھر بھی یہ احساس ضرور ہوا تھا کہ ان عورتوں جیسا کوئی بھی لباس، کوئی بھی ساڑھی اور کوئی بھی جوڑا فاخرہ کے پاس نہیں ہے۔ جانے کیوں اس سوچ نے اسے اداس سا کر دیا۔ وہ اپنے اندر ہولے ہولے اترنے والی اداسی کو صاف طور سے محسوس کر رہا تھا۔

وہ اپنے گھر کے دروازے پر پہنچا تو گلی کے کتوں نے بھونکنا شروع کر دیا۔

"ہٹ تیرے کی۔" اس نے ایک روڑا اٹھایا اور بھونکتے کتے کو مارتے ہوئے بولا۔ "اپنی ہی گلی کے ہو اور یوں بھونک رہے ہو جیسے میں نہیں کوئی چور آیا ہے......"

کتے پرے ہٹ گئے۔ اس نے دروازے پر دستک دی۔

"کون؟" فاخرہ کی آواز آئی...... جاوید کو یوں لگا جیسے وہ دروازے کے پاس ہی کھڑی تھی۔

"کھولو فاخرہ میں ہوں۔" جاوید نے کہا۔

فاخرہ نے دروازہ کھولا تو وہ تیز ہوا کے ریلے کی طرح اندر داخل ہوا۔ فاخرہ دروازہ بھی بند نہ کر پائی تھی کہ جاوید نے اسے بازوؤں میں سمیٹ لیا۔

"دروازہ تو بند کرنے دیں۔" فاخرہ کسمسائی۔

"بہت دیر ہو گئی۔ تم اکیلے میں گھبرا رہی ہو گی......" جاوید نے اسے چھوڑتے ہوئے معذرت خواہانہ انداز میں کہا۔

وہ خوبصورت انداز سے مسکرائی اور کنڈی بند کر کے جاوید کے پیچھے پیچھے چلی آئی۔

صحن عبور کر کے دونوں برآمدے میں آئے۔

"سردی بہت ہے آج۔" جاوید ٹھٹھر رہا تھا۔

"جلدی سے اندر چلئے۔ بستر میں گھس جائیں۔ میں چائے بنا کر لاتی ہوں۔"

"رہنے دو، اس وقت چائے کہاں بناؤ گی۔"

"کوئی بات نہیں۔ ایک منٹ میں لاتی ہوں۔"

جاوید کمرے میں چلا گیا۔ فاخرہ چائے بنانے باورچی خانے میں گھس گئی۔ کالی گرم شال میں اس نے اپنا سر منہ لپیٹ رکھا تھا۔

جاوید اندر چلا گیا۔ کمرہ خاصا گرم تھا۔ کوئلوں کی انگیٹھی ایک طرف پڑی تھی۔ آگ بجھ چکی تھی لیکن ابھی فضا گرم تھی۔

جاوید نے کوٹ اتار کر کرسی پر پھینکا۔ ٹائی کی گرہ کھول کر پلنگ کے کنارے پر ٹکتے ہوئے جوتے اتارنے لگا۔

بے بی سوئی ہوئی تھی۔ اس کا چہرہ سرخ تھا۔ سیاہ بالوں کی لٹیں چہرے پر جھکی تھیں۔ اس کے چہرے پر فرشتوں کی سی معصومیت تھی۔ جاوید کو اس پر بے طرح پیار آ گیا۔ سوئی ہوئی بچی کے ماتھے اور گالوں کو چوم کر وہ خوشی سے پھولا نہ سمایا۔

کپڑے بدل کر وہ بے بی کے بستر میں گھس آیا۔ جب فاخرہ چائے بنا کر لائی تو وہ کروٹ کے بل بے بی پر جھکا اسے پیار کر رہا تھا۔

"ہائے، اسے جگا نہ دیجئے گا۔ آپ کے جانے کے بعد جاگ گئی تھی۔ بڑی مشکل سے تھوڑی دیر ہوئی اسے سلایا۔"

جاوید سیدھا ہو کر فاخرہ کی طرف دیکھ کر مسکرایا۔ "یار بڑا جلتی ہو میری بچی سے تم۔"

فاخرہ نے اک ادائے دلفریبی سے سر کو جھٹکا دیا۔ پیالی اس کی طرف بڑھائی۔

جاوید نے ایک ہاتھ سے پیالی پکڑی۔ دوسرے ہاتھ سے فاخرہ کی کلائی اک ہلکے سے جھٹکے سے اسے اپنے پہلو میں گرا لیا۔

"اللہ۔ چائے نہ گر جائے بے بی پر......" فاخرہ نے اپنا آپ چھڑانا چاہا لیکن جاوید نے اس کے گال کو ہونٹوں سے چھو ہی لیا۔

چائے پی کر جاوید نے پیالی میز پر رکھ دی۔ پھر فاخرہ کو بھی اپنے ساتھ ہی بستر میں گھسا لیا۔

"کیسی رہی آج کی دعوت؟" فاخرہ اس کی چھاتی پر اپنا بازو رکھتے ہوئے بولی۔

"بہت اچھی ......" جاوید کو یکدم نورینہ کی حرکت یاد آگئی۔ وہ کچھ کھو سا گیا۔

"بہت سے لوگ آئے ہوں گے؟" اس نے پوچھا۔

"ہاں۔ بہت سے۔"

"نیند آنے لگی ہے۔"

"ہاں۔"

فاخرہ آہستگی سے بستر سے نکلی۔

"اٹھئے جناب، اپنے بستر پر جائیے۔" فاخرہ نے کہا۔

"اب میں یہیں سوؤں گا۔"

"بے بی۔"

"اسے پڑا رہنے دو...... میرے ساتھ ہی سوئے گی۔"

اس نے کروٹ بدل لی۔ دوسرے پلنگ پر فاخرہ جالیٹی۔ بچی کو اس نے آہستگی سے اپنے بستر پر کھینچ لیا۔

"کیوں...... کیوں......" جاوید نے گردن موڑ کر دیکھا۔

"میرے پاس سوئے گی۔"

"اور تم میرے پاس۔ آجاؤ......"

فاخرہ کا ہاتھ پکڑ کر اس نے اپنے بستر میں گھسیٹ لیا اور بڑی گرمجوشی سے بازوؤں میں بھر لیا۔ وہ اپنے پیار کا زیادہ سے زیادہ اظہار شعوری طور پر کر رہا تھا۔

نورینہ مضطرب و بے چین تھی۔ رات ممی ڈیڈی نے اسے گھر بھیج دیا تھا۔ جاوید کو دیکھ کر اس کی جو حالت ہوئی تھی، انہیں خدشہ تھا کہ پھر نروس بریک ڈاؤن نہ ہو جائے۔

رات اسے ٹرانکولائزر دے کر سُلا دیا گیا تھا لیکن صبح جب وہ بیدار ہوئی تو مضمحل اور پریشان تھی۔ اپنے خوبصورتی سے آراستہ کمرے میں نرم و گرم بستر میں جب اس کی آنکھ کھلی تو ذہن میں پہلا خیال رات والے واقعے کا آیا۔

وہ اسی کے بارے میں سوچنے لگی۔ وہ ہوش میں تھی۔ کوئی ذہنی دباؤ محسوس نہیں ہو رہا تھا۔ اس لیے سوچوں کا رخ صحیح سمت تھا۔

"وہ اسلم سے کتنی مشابہت رکھتا ہے۔ چلنے کا انداز بالکل ویسا ہے۔ ہنستا بھی تو اس کی طرح ہے...... آنکھیں بالکل اسلم کی ہیں......"

وہ سوچوں میں گم تھی

کہ

ممی کمرے میں آگئیں

"ہیلو نوری......"

"جی مما۔"

"اٹھ گئیں؟"

"جی دیر سے بیدار ہوئی ہوں۔ جی بستر سے نکلنے کو نہیں چاہ رہا۔"

"میں ایک گھنٹہ پہلے بھی تمہیں دیکھنے آئی تھی۔ تم سو رہی تھیں۔"

اس کی ممی بیڈ کے کنارے پر بیٹھتے ہوئے اس پر جھک گئیں اور اس کے تراشیدہ بالوں میں پیار سے انگلیاں الجھاتے ہوئے اس کی پیشانی چوم کر بولیں۔ "طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟"

نورینہ نے بڑی سچائی سے نفی میں سر ہلا دیا۔

"کیوں بیٹے؟" ماں کا دل دھک سے رہ گیا۔

"بس۔ بڑی ڈپریشن ہو رہی ہے۔"

"اوہ، نہیں۔ ایسا نہیں ہونا چاہیے۔"

"ایسا ہو رہا ہے ممی۔"

ممی چند لمحے چپ رہیں۔ متفکر سی نظر آئیں۔ ان کے خوبصورت اور ہلکے سے میک اپ والے چہرے پر تفکر اور پریشانی کے سائے رینگ گئے۔

نورینہ نے ایک ننھا سا قہقہہ لگایا۔

ممی ڈر گئیں۔ یہ ڈر ان کی پھیلی پھیلی آنکھوں سے چھلک رہا تھا۔

"نورینہ۔" وہ گھبرا کر بولی۔

"جی ممی۔" اس نے کہا۔

"تم ٹھیک نہیں ہو۔" وہ انگریزی میں بولیں۔ "میں تمہارے ڈیڈی کو بلاؤں۔"

"میں ٹھیک نہیں ہوں اور ٹھیک بھی ہوں۔ آپ پریشان نہ ہوں۔ میرا نروس بریک ڈاؤن نہیں ہوگا۔ ویسے بھی رات والے آدمی سے متاثر ضرور ہوں۔"

ممی اٹھ کر جانے لگی تھیں کہ اس نے ہاتھ پکڑ کر پھر بیڈ پر بٹھا لیا۔

"تمہارے ذہن میں ہر وقت اسلم کا خیال ہی ہوتا ہے نا......" ممی دکھ سے بولیں۔

"اسی لئے اس شخص کو تم نے معمولی سی مشابہت پر......"

"نہیں مام نہیں......" اس نے اپنا ماتھا ممی کے ہاتھوں پر رکھ کر کروٹ بدلی۔

"نورینہ۔"

"گھبرائیں نہیں ممی، میں پاگل نہیں ہوں لیکن آپ یہ بھی جھٹلانے کی کوشش نہ کریں کہ وہ شخص اسلم سے پوری پوری مشابہت رکھتا ہے۔ میں اس سے ملنا چاہوں گی۔"

"ٹھیک ہے۔"

"وہ ڈیڈ کے دفتر کا آدمی ہے؟"

"ہاں۔"

"میں اس سے مل سکتی ہوں۔"

"نو پرابلم......"

"آپ فکر مند نہ ہوں۔ میں ڈیڈی سے خود بات کروں گی۔"

"ٹھیک ہے۔"

ممی چند لمحے بیٹھی رہیں۔ ان کی آنکھوں میں کرب و اذیت کے واضح اثرات تھے۔

"اٹھو، تیار ہو جاؤ۔ دن کافی نکل آیا ہے۔ ناشتہ نہیں کرو گی۔"

"کروں گی کیوں نہیں۔"

"ہم ناشتے کی میز پر تمہارا انتظار کریں گے۔" ممی اُٹھ کھڑی ہوئیں۔

"چیئر اپ۔ نورینہ...... فکر مند ہونا تمہاری صحت کے لیے اچھا نہیں۔"

ایک لمبی گہری سانس لے کر نورینہ نے ماں کی طرف دیکھا۔

ممی کمرے سے نکل گئیں۔

اپنی اکلوتی بچی کے دکھ سے وہ پژمردہ ہو رہی تھیں۔

کمرے سے نکل کر وہ کوریڈور میں آئیں تو ان کی آنکھوں میں آنسو تھے جنہیں وہ بہ ہزار دقت ضبط نہ کر سکیں۔

نورینہ ان کی اکلوتی بیٹی تھی۔ پہلے بچے کے مرنے کے بعد اوپر تلے دو آپریشن ہوئے تھے اور جب بڑی منتوں مرادوں اور علاج و معالجے کے بعد نورینہ پیدا ہوئی تو ان کی خوشیوں کا ٹھکانہ نہیں تھا لیکن یہ خوشیاں مر جانے کو تھیں جب تین دن کی بچی کو

نمونیہ ہو گیا اور وہ موت و حیات کی کشمکش میں کئی دن رہی۔ ماں باپ کے لیے یہ آزار ایسا تھا کہ برداشت نہ کر سکنے کے باوجود برداشت کر رہے تھے۔

پانچ چھ سال کی تھی کہ جھولے سے گر کر بازو ٹوٹ گیا۔ چھ سات ماہ اس بازو کی وجہ سے ماں باپ کی خوشیاں زنگ آلود رہیں۔ گو اس دوران دو بیٹے بھی ہو گئے تھے۔ پھر بھی بچی سے شاید زیادہ ہی پیار تھا اور پھر یہ بات بھی تو ایک سچائی ہے کہ شکستہ ہو تو عزیز تر۔ نورینہ ماں باپ کی جتنی پیاری تھی۔ دکھ اور تکلیفیں اتنی ہی اسے تاکا کرتی تھیں۔ نو دس سال کی عمر میں ٹائیفائیڈ ہوا تو جان کے لالے پڑ گئے۔ ڈاکٹروں کا خیال تھا بخار میں اگر وہ بچ بھی گئی تو کوئی نہ کوئی عضو ضرور متاثر ہو جائے گا۔

وہ تو خدا نے خیریت ہی رکھی۔ کمزور ایک عرصہ تک رہی لیکن کوئی عضو متاثر نہ ہوا۔

بچی کی تکلیفوں نے ممی ڈیڈی کے دل کو گداز کر دیا تھا۔ وہ بیٹوں سے زیادہ بیٹی کی دلجوئی میں لگے رہتے۔ خدا نے دولت اور زندگی کی ہر آسائش سے نوازا ہوا تھا۔ حلقہ احباب وسیع تھا۔ خاصے لوگ تھے لیکن نورینہ پر کوئی نہ کوئی افتاد آپڑتی کہ ساری خوشیوں کے رنگ پھیکے پڑ جاتے۔ ہر بیماری تو جیسے اسی پر آزمانے کے لیے وجود میں آئی تھی۔ بچپن اس طرح گزرا، جوانی میں بیماریوں سے تو پیچھا چھوٹا لیکن اور روگ لگ گئے۔ سترہ اٹھارہ سال کی تھی کہ ممی نے اپنے رشتے کے بھتیجے سے نکاح کر دیا۔ وہ امریکہ میں تھا اور وہاں کے ماحول اور معاشرے میں جذب ہو چکا تھا۔ رخصتی کی نوبت ہی نہ آئی اور اس نے طلاق دے دی۔ نورینہ اور ماں باپ کے لیے یہ صدمہ جانکسل تھا۔ نورینہ تو دو تین سال نارمل نہ ہو سکی۔ طلاق کی اذیت سے نبرد آزما ہونا بھی تو سہل نہ تھا۔

خدا خدا کر کے وہ سنبھلی...... بیس اکیس برس کی ہو چکی تھی۔ ممی متفکر رہنے لگی تھیں لیکن کہیں رشتے کی بات چلاتے ہوئے بھی ڈرتی تھیں۔ طلاق کا داغ لگ چکا تھا۔ اپنوں نے دغا دیا تھا۔ دوسروں پر کیا اعتماد لیکن ماں باپ حوصلہ مند تھے۔ حوادث کی آندھیوں میں بھی جینے کی راہ بنالی تھی۔ سوشل تھے۔ لوگوں کے ہجوم میں گھر کر اپنی پریشانیاں مٹا لیا کرتے تھے۔ نوشتہ تقدیر پر راضی ہونا بھی سیکھ لیا تھا۔

پھر نورینہ کی زندگی نے اک خوبصورت کروٹ لے لی تھی۔ دو سال پہلے اس کی اچانک ہی ملاقات اسلم سے ہوئی تھی۔ اس ملاقات نے آہستہ آہستہ محبت کا بیج بویا۔ وقت کے ساتھ ساتھ یہ پودا بنا۔ پھلا پھولا اور اس کی ہریالی اور مہک کے چرچے ہونے لگے۔

نورینہ بائیس تیئس برس کی ہو رہی تھی۔ اسلم اچھا آدمی تھا۔ اس کی اپنی انجینئرنگ کمپنی تھی اور وہ عمارتوں اور پلوں کے ٹھیکے بھی لیا کرتا تھا۔ سٹیٹس سے انجینئرنگ کی تھی۔ خاصا سمارٹ اور سیلف میڈ آدمی تھا۔ اس نے نورینہ کو چاہا اور طلاق کے داغ کو نظر انداز کرتے ہوئے اسے اپنانے کے لیے پروپوزل دے دیا جو بغیر کسی تردّد کے قبول کر لیا گیا۔

منگنی دھوم دھام سے ہوئی۔ اس دن نورینہ کی خوشیوں کا کوئی ٹھکانہ نہیں تھا۔ اندرونی خوشیوں کی ساری چمک چہرے پر نکھر آئی تھی۔ وہ ایک دم بے حد حسین لگنے لگی تھی۔ مایوسیوں اور نامرادیوں کے بادل چھٹ جانے کے بعد نکھرے آسمان پر چمکتے چاند کی روشنی بھی تو بڑی جاندار ہوتی ہے۔

ممی بھی خوش تھیں۔ چہکتی پھرتی تھی۔

اور

ڈیڈی بھی مسرور تھے۔ ناامیدی کے اندھیروں سے دمکتے ماہتاب کا چہرہ جو دکھائی دیا تھا۔

لیکن یہ خوشیاں دیرپا نہ تھیں۔ چند ماہ بھی ان کی حیات نہ تھی۔ اسلم کاروباری سلسلے میں یو کے گیا۔ وہاں سے جرمنی اور مڈل ایسٹ ہوتا ہوا واپس آیا۔ وہ بہت بڑی بزنس لے کر آیا تھا۔

اس نے آتے ہی نورینہ کے کان میں سرگوشی کی۔ "تم میرے لیے بہت لکی ثابت ہوئی ہو...... میں نے لاکھوں ڈالر کی بزنس کی ہے۔ یہ سب تمہاری وجہ سے ہوا ہے۔"

وہ اترا کر اسے تکنے لگی تھی لیکن یہ خوشیاں عارضی تھیں۔ حباب بر آب تھیں۔

اسی ماہ گاڑی کے ایکسیڈنٹ میں اسلم ختم ہو گیا۔

یہ سب کچھ ایسا اچانک اور ایسا غیر متوقع تھا کہ نورینہ تو کیا اس کے ممی ڈیڈی

بھی جیسے ذہنی دھچکے سے پاگل ہوگئے۔ قیامت ٹوٹ پڑی تھی۔ دھان پان سی نورینہ جس کا وجود پہلے ہی جھٹکے کھا کھا کر اپنی ہمت و طاقت کھو چکا تھا، اس صدمے کو سہار نہ سکی۔

اس پر دیوانگی کا فٹ پڑا۔

اور

پھر

کئی ماہ وہ ذہنی توازن میں آنے کے مرحلے سے گزرتی رہی۔ اسے شاٹس لگے۔ دوائیوں سے علاج ہوا۔ نفسیاتی معالج نے ٹریٹ کیا۔

تب کہیں مہینوں میں جا کر اس کی حالت سنبھلی...... وہ اب معمول پر آگئی تھی اور اس ذہنی کرب سے نکل چکی تھی جو اسلم کی موت سے ملا تھا۔

اب یادیں ضرور تھیں لیکن اس سچائی اور حقیقت کو اس نے ذہنی طور پر قبول کر لیا تھا۔

ممی ڈیڈی نے اس کے پورا پورا صحت مند ہونے پر ہی تو اتنی شاندار دعوت دی تھی۔ اتنا تزک و احتشام سے صحت یابی کا جشن منایا تھا۔

لیکن نورینہ کی تقدیر میں کاتب تقدیر کا قلم دکھ اور کرب ہی لکھتا چلا گیا۔

رات ایک اجنبی چہرے میں اسے اسلم کی اتنی مشابہت نظر آئی تھی کہ وہ بالکل ہی اپ سیٹ ہو گئی تھی۔

اور

یہ بات اس کی ممی کے لیے پریشان کن تھی۔ ممی ہو چاہے امی، ممتا کے جذبات تو ایک جیسے ہی ہوتے ہیں۔ جنم دینے کا قدرتی عمل بچے کے ساتھ جن جذبات کو جنم دیتا ہے، وہ ہر ماں کے لیے ایک طرح کے ہوتے ہیں۔ امیر و غریب کی تخصیص ہوتی ہے۔ نہ ماڈرن اور اجڈ کی...... یہ جذبات ہر ماں کے سینے میں ایک جیسے ہوتے ہیں۔

بالکل

ایک جیسے۔

"جاوید۔"

"ہوں۔"

"بھئی تم اس رات کہاں غائب ہو گئے تھے؟"

"ہاں واقعی...... کھانے کے بعد تم نظر ہی نہ آئے۔"

"حالانکہ لطف تو کھانے کے بعد آیا۔"

"کیوں؟"

"گانے بجانے کا پروگرام تھا...... کیا مزہ آیا۔ یار ہم نے بھی اپنی زندگی میں ایسی محفل میں حصہ لے ہی لیا......"

ارشد، جمیل اور ہمایوں کینٹین میں بیٹھے جاوید سے پوچھ رہے تھے کہ اس دن کیوں غائب ہو گئے۔

ڈنر کے دوسرے دن چھٹی تھی۔ اس سے اگلے دن جمعہ اور آج ہفتے کو سب آفس میں اکٹھے ہوئے تھے۔

"لگتا ہے مس نورینہ سے ڈر کر بھاگ گئے تھے۔" ارشد نے چھیڑا...... جاوید کے کان سُرخ ہو گئے۔ اس نے چائے کا گھونٹ لیتے ہوئے تیز نظروں سے ارشد کو دیکھا۔

"مجھے تو بیچاری پر بڑا ترس آیا۔" جمیل نے کہا۔ "کہاں تھی وہ......"

"اس کے بعد وہ بھی نظر نہیں آئی۔" ارشد نے جواب دیا۔

جاوید نے ان کی طرف دیکھا لیکن بولا کچھ نہیں۔

ارشد کو مذاق سوجھا۔ ہنس کر بولا۔ "بن جاؤ اسلم یار۔"

جمیل نے شوخی سے کہا۔ "وہ کیا بنے گا۔ خدا قسم مجھے کبھی اسلم کہتی نا تو اسی وقت قدموں میں گر جاتا۔ میں بندۂ بے دام ہوں۔ بخدا مجھے اسلم ہی سمجھے...... زندگی بن جائے گی میری۔"

جمیل نے ہاتھ جوڑ کر اتنے مضحکہ خیز انداز میں کہا کہ ہمایوں اور ارشد تو ہنسے ہی۔ جاوید بھی جو سنجیدہ بنا بیٹھا تھا، مسکرائے بغیر نہ رہ سکا۔

تینوں باری باری تمسخرانہ انداز میں باتیں کرنے لگے۔

جاوید پہلے تو چپ رہا...... پھر بولا۔ "تم لوگوں کو آج اور کوئی موضوع نہیں ملا۔"

"اوہ میرے یار...... یہی تو آج کا موزوں ترین موضوع ہے۔" ارشد بولا۔

"آج کی تازہ خبر۔" جمیل نے گا کر کہا۔

ہمایوں نے میز بجاتے ہوئے جمیل کی بات دہرائی۔ "تازہ خبر، تازہ خبر......"

جاوید بے حد سنجیدہ ہو گیا۔ پیالی میز پر رکھتے ہوئے بولا۔ "کچھ باتیں ایسی ہوتی ہیں دوستو جو مذاق میں بھی اچھی نہیں لگتیں۔ چاہے کتنی ہی بے ضرر کیوں نہ ہوں۔"

تینوں ذرا شرمندہ سے ہوئے لیکن ایک لمحہ کے بعد جمیل نے کہا۔ "یہ مذاق بھی ہے اور حقیقت بھی...... کیا تمہیں مس نورینہ نے اسلم نہیں کہا...... نہیں سمجھا...... بتاؤ نا......"

"وہ ذہنی مریضہ رہ چکی ہے اور تم سب کو علم ہے۔ ان کے ساتھ کتنی بڑی ٹریجڈی ہو چکی ہے۔"

تینوں شرمندگی سے ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔

"اور تم لوگ یہ بھی جانتے ہو کہ میں شادی شدہ ہوں۔ میری ایک بچی ہے۔ میں اپنے حالات سے مطمئن ہوں اور ایک بھرپور زندگی گزار رہا ہوں۔"

"اوہ یار چھوڑو...... تم کہاں سے کہاں پہنچ گئے۔ ہم تو ویسے ہی چھیڑ رہے

تھے۔" ارشد نے پیالی خالی کر کے سگریٹ نکالا۔ سگریٹ کے سرے کو ہونٹوں اور زبان سے گیلا کیا۔ پھر سگریٹ کی ڈبی پر ایک دو بار مارا۔

"ہم نے تو سرسری سی بات کی ہے۔" جمیل نے ماچس جلا کر پہلے ارشد کے ہونٹوں میں دبا سگریٹ سلگایا، پھر اپنا سگریٹ سلگانے کے لیے جلتی ماچس کی تیلی دونوں ہاتھوں کے بند پیالے میں سگریٹ تک لے گیا۔ سگریٹ سلگا کر اس نے ایک لمبا کش لیا۔

اور ارشد نے

دھواں جاوید کے چہرے پر چھوڑتے ہوئے جمیل کو آنکھ ماری۔ دونوں مسکرانے لگے۔

"تم تو اتنے سنجیدہ ہو گئے ہو۔ جیسے...... جیسے......" جمیل کچھ کہتے ہوئے جھجکا۔

لیکن

ہمایوں نے ہنستے ہوئے بات پوری کر دی۔ "جیسے اس نے برمالا تمہارے گلے میں ڈال دی ہو۔"

سب نے ایک قہقہہ لگایا۔ جاوید جھلا کر اٹھ کھڑا ہوا۔ چھٹی کا وقفہ ختم ہو رہا تھا۔ جاوید آگے آگے اور تینوں پیچھے پیچھے آفس کی عمارت میں آ گئے اور اپنے اپنے ٹھکانوں پر بیٹھ کر کام کرنے لگے۔

جاوید بھی اپنی سیٹ پر آ بیٹھا۔ اس کا جی کچھ اچاٹ سا تھا۔ اس رات کا واقعہ ذہن پر اثر انداز تھا اور چھٹی حس کچھ نہ کچھ ہونے کا الارم دے رہی تھی۔

جاوید نے اپنے سامنے رکھی تینوں فائلوں پر نگاہ ڈالی۔ پھر ہلکے نیلے کور والی فائل اپنے سامنے کھول کر بیٹھ گیا۔ اس ماہ کی جتنی ٹرانزیکشنز ہوئی تھیں، اسی فائل میں تھیں۔ وہ فائل کھول کر کام میں مصروف ہو گیا۔

"باؤ جی۔" چپڑاسی نے قریب آ کر پکارا تو وہ سر اُٹھا کر اسے استفہامیہ نظروں سے دیکھنے لگا۔

"اشفاق صاحب نے بلایا ہے۔"

"مجھے؟"

"ہاں۔"

"یہ فائل دیکھنی ہے۔"

"کہا ہے کہ فائل لے کر آئیں۔"

"اچھا آتا ہوں۔"

وہ جلدی جلدی فائل پر پن سے نشان لگانے لگا۔ تھوڑا سا ہی کام تو باقی تھا۔ تیزی سے قلم چلاتے ہوئے اس نے کام ختم کیا اور فائل اٹھا کر بغلی کمرے میں چلا گیا۔

یہ چھوٹا کمرہ تھا۔ اشفاق صاحب یہاں ہی بیٹھتے تھے۔

"سار کو والی فائل یہی ہے نا؟"

"جی۔"

"اندر لے جاؤ۔ بڑے صاحب چیک کرنا چاہتے ہیں......" اشفاق نے فائل کھول کر ایک نظر دیکھی اور پھر اس کی طرف بڑھا دی۔

نور احمد کے آفس میں جاتے ہوئے جاوید کا دل بے طرح دھڑک اٹھا۔ چند لمحے وہ تذبذب کے عالم میں رہا۔

"کیوں جاوید صاحب...... کام پورا نہیں کیا؟" اشفاق نے پوچھا۔

"نہیں سر، کمپلیٹ ہے۔" وہ بولا۔

"پھر لے جاؤ، کھڑے کیوں ہو؟"

"جاتا ہوں سر۔"

وہ ٹیک کا دروازہ کھول کر آہستگی سے آگے بڑھا۔ دروازے پر کھڑے کھڑے اس نے پوچھا۔ "میں اندر آ سکتا ہوں سر......"

نور احمد ریوالونگ چیئر پر بیٹھے پائپ پی رہے تھے۔ شاندار آفس تھا۔ ہیٹر نے کمرے کی فضا خوشگوار بنا رکھی تھی۔ آفس ٹیبل کافی بڑی تھی۔ ایک طرف فون رکھے تھے۔ دوسری طرف فائلیں۔ ٹرے میں آج کی ڈاک پڑی تھی۔

نور احمد صاحب کچھ غیر حاضر تھے۔ ہمیشہ دفتر میں وہ چاق و چوبند رہتے تھے۔ کام کے وقت کام کے عادی تھے۔ آج خلاف معمول بڑے تساہل سے کرسی کو ہولے ہولے ادھر ادھر گھماتے پائپ پی رہے تھے۔

"آ جاؤ۔" انہوں نے ایک جگہ رک کر دونوں کہنیاں ٹیبل پر ٹکا دیں۔

"یہ سار کو کی فائل ہے سر۔" جاوید نے مودبانہ فائل میز پر رکھ دی۔ نور احمد نے اک بھرپور نگاہ اس پر ڈالی۔

وہ اندر ہی اندر کانپ سا گیا۔

"بیٹھو۔" نور احمد نے بڑی شفقت سے کہا۔

وہ سامنے والی کرسی پر بیٹھ گیا۔ فائل نور احمد نے ایک طرف کر دی اور جاوید کو یوں تکنے لگے جیسے اس کا بھرپور جائزہ لے رہے ہوں......

پھر

انہوں نے پائپ ایش ٹرے میں رکھ کر ہاتھوں کی مٹھیوں پر ماتھا ٹکا دیا۔

چند لمحے گزر گئے۔

جاوید بڑا بے چین ہوا۔

"مسٹر جاوید۔" نور احمد نے سر اٹھا کر اسے بغور دیکھا۔

"یس سر۔"

وہ بڑے گھمبیر انداز میں مسکرائے، پھر بولے۔ "تم کب سے میرے ہاں ملازمت کر رہے ہو؟"

"سر اس نومبر میں پانچ سال ہو گئے ہیں۔"

"کمال ہے، پانچ سال۔"

"یس سر۔"

"اور میں نے آج تک تمہیں بغور دیکھا نہیں۔"

"جی۔"

"نورینہ نے اس رات غلط نہیں کہا۔ تم تو لگتا ہے اسلم کے بھائی ہو۔ بالکل

ویسی شکل و صورت...... قد...... جسم حتیٰ کہ دیکھنے اور باتیں کرنے کا انداز بھی وہی ہے۔"

"حیرت کی بات ہے سر۔ میں نے اسلم صاحب کو کبھی دیکھا، نہ ان سے کوئی رشتہ داری ہے۔"

"ویسے ناک نقشہ تو اس سے کچھ فرق ہے لیکن مشابہت بہت زیادہ ہے۔"

"ہو گی۔"

"تم شاید میری بیٹی کے ساتھ ہونے والی ٹریجڈی سے آگاہ نہیں ہو۔"

وہ مضطربانہ انہیں دیکھ کر بولا۔ "کچھ سنا ضرور ہے۔ اسلم شاید ان کے منگیتر تھے اور کسی حادثے میں......"

"کار ایکسیڈنٹ۔"

"اوہ...... موقع پر ہی ہلاک ہو گئے۔"

"ہاں......"

پھر وہ چپ ہو گئے۔ چند لمحوں بعد جاوید اٹھتے ہوئے بولا۔ "میں جا سکتا ہوں سر؟"

"ہوں۔"

وہ اٹھ کر آفس سے باہر آ گیا۔

نورینہ کی ممی اور ڈیڈی لابی میں بیٹھے تھے۔ ممی سویٹر بن رہی تھیں۔ سوشل ویلفیئر کی طرف سے مینا بازار لگ رہا تھا۔ اس میں یہ سویٹر انہوں نے دینا تھا۔ وہ خاصی مشہور اور مقبول سوشل ورکر تھیں۔ بیٹی کی پریشانیوں سے فرار کا حل انہوں نے یہی ڈھونڈا تھا۔ عام بیگمات کی طرح وہ صرف تصویریں اتروانے اور اخباری بیان دینے کی غرض سے یہ کام نہ کرتی تھیں۔ اپنی سوچوں اور تفکرات سے نجات پانے کے لیے انہوں نے یہ طریق اختیار کیا تھا۔

نور احمد صاحب کا وقت بھی کاروبار میں گزرتا تھا لیکن آئے دن نئی سے نئی افتاد پڑ جاتی تو دونوں کا حوصلہ جواب دینے لگتا۔

نورینہ اسی دن سے گم صم تھی۔ گو حواس میں تھی، پھر بھی بد حواس لگتی تھی۔

"ہم کیا کر سکتے ہیں" نور احمد نے بیچارگی سے بیوی کی طرف دیکھا۔ دونوں کافی دیر سے حالات کا جائزہ لے رہے تھے۔

"میں تو کہتی ہوں......"

"کیا، رُک کیوں گئیں......؟"

"بھئی اس آدمی کا اتہ پتہ معلوم کرو۔"

"وہ میرے دفتر میں اکاؤنٹس کلرک ہے۔"

"کیا ہوا...... پڑھا لکھا تو کچھ نہ کچھ ہو گا۔"

"بی اے ہے۔"

"پھر کیا سوچتے ہو؟"

"سوچنے کی بات تو ہے ہی۔"

"سوچنے کی بے شک ہے لیکن دیر کرنے کی نہیں۔ آپ نورینہ کی حالت نہیں دیکھ رہے۔"

"دیکھ رہا ہوں۔"

"اچھی بھلی ہو گئی تھی۔ ہر کام میں دلچسپی لینے لگی تھی۔ بس اسی دن سے پھر ڈوبتی جا رہی ہے۔ مجھے تو ہول آتا ہے، اسے دیکھ دیکھ کر۔ گھر سے بھی نکلنا چھوڑ دیا ہے۔ کسی سہیلی کے ہاں بھی نہیں جاتی۔ میری دوستوں سے نہیں ملتی۔ اپنے کمرے میں بستر پر اوندھی پڑی سوچوں میں گم رہتی ہے۔"

"تم نے اس سے کبھی پوچھا کہ ایسا کیوں کرتی ہے؟"

"ہاں۔"

"پوچھ کر اسے اور مضطرب کروں؟"

"پھر بھی......"

"میرے خیال میں اسے اس آدمی سے ملنے جلنے دینا چاہیے۔"

"ہوں۔"

"ہو سکتا ہے، وہ اسلم کو اس میں تلاش کر لے اور یہ بھی ممکن ہے کہ اسے ملنے جلنے پر پوری طرح احساس ہو جائے کہ یہ آدمی اسلم نہیں ہے......"

"بات تو ٹھیک ہے۔"

"میں ڈاکٹر آفندی کے پاس گئی تھی۔"

"اوہ، اچھا اسی لیے یہ نفسیاتی علاج تجویز کر رہی ہو۔"

"انہوں نے یہی کہا ہے۔"

"ٹھیک ہے، میں کل جاوید سے بات کروں گا۔"

"بات کیا کرنی ہے...... اسے کل شام چائے پر مدعو کریں۔"

"یہ بھی ٹھیک ہے۔"

نور احمد نے ایک گہری سانس چھوڑی۔ کچھ دیر وہ کرسی پر پڑے رہے۔ پھر وال کلاک پر نظر ڈالی۔ ٹھیک پانچ بجے انہیں ایک میٹنگ میں جانا تھا۔ وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔ نورینہ کی ممی نے بھی سلائیاں رکھ دیں۔ دونوں بیٹے کالج سے آ گئے تھے۔ نوید ایف ایس سی (میڈیکل) کر رہا تھا اور سعید نے اسی سال کالج میں داخلہ لیا تھا۔

"ہیلو بے بی۔"

"اوں ہوں...... مجھے بے بی نہ کہا کریں ابو۔"

"تو کیا کہا کروں اپنے بے بو کو؟"

"سعدیہ بانو ابو جی۔"

"اوہو...... ہم تو اتنا خراب سا نام نہیں پکار سکتے۔ ہم تو بے بی ہی کہیں گے۔"

"میں روٹھ جاؤں گی۔ پھر مانوں گی بھی نہیں......"

"نہ...... نہ نہ۔ ایسا مت کرنا سعدیہ بانو جی۔ آپ روٹھیں تو ہم بے موت مر جائیں گے۔"

"ہائے اللہ نہ کرے۔" باپ بیٹی کی چہلیں سن کر فاخرہ جلدی سے بولی۔ آج یہ مختصر سی فیملی بے حد خوش تھی۔

صبح صبح ہی جاوید کو فاخرہ نے مژدہ جانفزا سنایا تھا۔ اس کی طبیعت کئی دنوں سے خراب رہتی تھی۔ صبح بھی اُبکائیاں آ رہی تھیں کہ جاوید نے پوچھا۔ "کسی ڈاکٹر کے پاس جاؤ نا۔ روز ہی صبح صبح دل متلاتا ہے۔"

اور

فاخرہ نے ایک حجاب آلود مسکراہٹ اس پر ڈالی تو وہ کچھ کچھ سمجھ گیا۔ فاخرہ کو دونوں بازوؤں سے تھام لیا۔ "سچ؟"

فاخرہ نے ادائے دلبری سے سر اثبات میں ہلایا۔ اسے کتنی شرم آ رہی تھی۔

"بیٹی کہ بیٹا۔" فرط مسرت سے جھولتے ہوئے اس نے فاخرہ کو اپنے سینے

میں سمو لینے کی کوشش کی تھی۔

پھر بے بی اندر آ گئی تو اس نے اسے اٹھا کر ہوا میں دو تین بار اُچھالتے ہوئے کہا۔ "بے بو۔ بہن لو گی یا بھائی؟"

"کہاں ہے؟"

"آ جائے گا۔"

"کب ابو؟"

"یہی کوئی آٹھ مہینے بعد۔"

"کہاں سے آئے گا؟"

"بس کرو بے بی۔ کیا باتیں کئے جا رہی ہے۔"

"اسے مت کہو جی کچھ۔ آپ کی اور آپ کے صاحبزادے کی اہمیت اپنی جگہ اور ہماری بے بی کی اپنی جگہ۔ اس پیارے پیارے گولے مٹولے سے تو کوئی نہیں مل سکے گا۔"

فاخرہ ہنس پڑی۔ "صاحبزادہ۔" اس نے زیر لب دہرایا۔

"فکر نہ کرو، صاحبزادہ ہی آئے گا۔"

"ہونہہ۔" وہ شانِ تفاخر سے مسکرا رہی تھی۔

اور

اب جاوید دفتر سے آیا تو خوشی سے سائیکل ڈیوڑھی میں ہی دیوار کے ساتھ گراتے ہوئے فاخرہ کو خوشخبری سنائی۔ "میں سپروائزر ہو گیا ہوں فاخرہ۔ میری تنخواہ دو سو روپے بڑھ گئی ہے۔"

"اللہ" فرط مسرت سے فاخرہ کا چہرہ چمک اٹھا تھا۔

جاوید نے لڈوؤں کا دو سیر کا ڈبہ بیوی کو دیتے ہوئے کہا۔ "میں مٹھائی ساتھ ہی لے آیا، پتہ تھا یہ خبر سنتے ہی بازار دوڑاؤ گی۔"

وہ مسکرا مسکرا کر جاوید کو تکنے لگی۔

"یہ ہمارے صاحبزادے کی قسمت جاگی ہے فاخرہ جانی۔" اس نے بیوی کے

کان میں سرگوشی کی۔

اس نے یونہی اثبات میں سر ہلا دیا اور لڈوؤں کا ڈبہ میز پر رکھ کر تھال لینے باورچی خانے میں چلی گئی۔

جاوید بے بی سے کھیلنے لگا۔ بے بی چار سال کی ہو رہی تھی۔ بے حد باتونی تھی۔ اس کی پیاری باتیں سن کر ماں باپ دونوں ہی نہال ہوتے تھے۔

فاخرہ تھال لا کر اس میں لڈو رکھنے لگی۔ محلے میں آٹھ دس گھر تھے۔ سب کچھ انہی کی طرح کے لوگ تھے۔ ایک آدھ گھر ہی طبقاتی لحاظ سے ان سے الگ ہو گا ورنہ سبھی مہنگائی کے اس زمانے میں آٹے دال کے چکروں میں سرگرداں نظر آتے تھے۔ محلے میں چھوٹی چھوٹی خوشیاں اور چھوٹے چھوٹے دکھوں کی سانجھ تھی۔ کسی کے گھر میں کوئی خوشی کا لمحہ سرسراتا تو بازار سے بوندی کے چھوٹے چھوٹے لڈو آجاتے۔ تین یا چار لڈو فی گھر کے حساب سے تقسیم کرنے والا یہ سمجھتا کہ اس نے خوشی کے اس سرسراتے لمحے کا اعلان کر دیا ہے۔

جاوید کے ہاں تو آج خوشیاں بٹنا تھیں۔ دو دو خوشیاں تھیں۔ فاخرہ تین تین فی گھرانے کے حساب سے لڈو رکھنے لگی تو پلنگ پر بیٹھا جاوید شوخی سے بولا۔

"کُل تین تین لڈو؟"

"تو اور؟"

"دو دو خوشیاں اور تین تین لڈو۔"

"دو...... دو"

"ہاں میری جان دو...... دو......" جاوید نے اپنی خوبصورت آنکھوں کو شوخی سے گھما کر اس کے پیٹ کی طرف اشارہ کیا تو وہ سرخ ہو گئی۔ چمکتی آنکھوں سے اسے گھورا اور پھر اس نے تین تین کی جگہ پانچ پانچ لڈو رکھ دیے۔

جاوید نے ایک لڈو اٹھا کر آدھا بیٹی کے منہ میں ڈالا۔ آدھا خود کھا لیا۔

"آہا...... آہا......" بچی مزے سے لڈو کھانے لگی۔

"تین مہینے کا ایریر بھی ملے گا......" جاوید نے بے بی کو پھر اُچھالا۔

"اچھا جی، پہلے بتایا ہی نہیں۔" فاخرہ بولی۔

"تم سے کیا چھپا رکھا ہے بھلی لوگ۔ جو کچھ میرا ہے، وہ تمہارا۔ ہماری تو جان بھی اپنی نہیں...... جسم، روح، دل و دماغ سب تمہارا ہے......"

فاخرہ مسرت و تفاخر کی بلندیوں کو چھونے لگی۔ چہرہ چمک اٹھا اور آنکھوں میں عقیدت و محبت کے لامتناہی سلسلے پھیل گئے۔

شام فاخرہ نے دو سیر لڈو اور منگوائے۔ جاوید کی بہنوں اور بھائیوں کو ترقی کی خوشخبری سنانے وہ خود گئی۔

جاوید اس پر جیسے نچھاور ہو گیا۔ اس کے غریب بہن بھائیوں کا جس طرح فاخرہ خیال رکھتی تھی، وہ جانتا تھا کہ بہنوں اور بھائیوں کا ردعمل مخالف ہوتا ہے۔ وہ فاخرہ کی اعلیٰ ظرفی کا قائل تھا۔

وہ سب کا طرزِ عمل دیکھتا تھا لیکن فاخرہ کی زبان پر کبھی حرفِ شکایت نہ آیا تھا۔

کبھی کبھی جاوید خود ہی کہتا۔ "تمہیں ان لوگوں کے طرزِ عمل سے مایوسی تو ہوتی ہو گی۔ برا بھی لگتا ہو گا۔"

"ہرگز نہیں۔" وہ کہتی۔ "میں کسی سے بدنیت نہیں ہوں۔ اللہ تعالیٰ نیتوں کو جانتا ہے اور اس کا پھل بھی دیتا ہے۔ خدا نے مجھے ایک پرسکون گھر دیا ہے۔ ٹوٹ کر چاہنے والا شوہر اور پھول سے بچے...... کیا یہ اس کا انعام نہیں؟"

جاوید جان و دل سے اس پر فدا ہو جاتا۔

دن کتنے سکون سے گزر رہے تھے۔

گیٹ پر چوکیدار نے اسے روکا۔

"کس سے ملنا ہے؟"

"نور احمد صاحب گھر پر ہی ہوں گے؟"

"جی ہاں، آپ کا نام جاوید احمد تو نہیں؟"

چوکیدار نے رستہ دیتے ہوئے کہا۔ جاوید سائیکل سے اتر چکا تھا۔ اسے گیٹ کے اندر لا کر بولا۔ "جی ہاں...... میں جاوید ہی ہوں۔"

"تشریف لے چلیے۔" چوکیدار کا ڈنڈے مار لہجہ ایک دم نرم ہو گیا۔ جاوید نے اندازہ کر لیا کہ نور احمد اس کے انتظار میں ہیں۔

"سائیکل یہیں کھڑی کر دوں؟" جاوید نے پوچھا۔

"جی کر دیں۔ میں یہیں بیٹھا ہوں۔ بیگم صاحبہ اور صاحب آپ ہی کا انتظار کر رہے ہیں۔"

"پارٹی وغیرہ ہے کوئی؟"

"نہیں صاحب، مجھے تو علم نہیں۔"

جاوید نے سائیکل سٹینڈ پر کھڑی کر کے لاک لگایا اور وہیں کھڑے کھڑے ڈرائیو وے کے دونوں طرف کشادہ چمنوں پر نگاہ ڈالی۔

سہ پہر ڈھل رہی تھی۔ سورج تیزی سے نیچے جا رہا تھا اور اس کی کرنوں کی رنگت اڑی جا رہی تھی۔ سردیوں کے دن بھی کتنے مختصر ہوتے ہیں۔ صبح کی آنکھ کھلتی ہے۔ پوری طرح بیدار بھی نہیں ہو پاتی کہ زوال شروع ہو جاتا ہے۔ آج سردی قدرے

کم تھی۔ دوپہر تو دھوپ خاصی جاندار تھی۔ اب کچھ کچھ ٹھنڈ اتر رہی تھی۔

جاوید نے ٹھنڈی پتلون پر جرسی پہن رکھی تھی۔ شہر سے یہاں تک سائیکل چلاتے آیا تھا۔ ٹانگوں میں تکان اور سردی سے ہلکا ہلکا درد محسوس ہونے لگا تھا۔

کشادہ اور خوبصورت لانوں میں گھری سرخ چھتوں والی کوٹھی بڑی شاندار تھی۔ سرخ چھتوں پر سبز بیلیں بڑے تساہل سے پڑی تھیں اور لانوں میں موسمی پھول سبزے میں گھرے بے حد بھلے لگ رہے تھے۔

دروازے پر پہنچ کر جاوید نے ایک نظر ساگوان کے خوبصورت دروازے پر ڈالی۔ نور احمد کی امارت ایک ایک چیز سے بول رہی تھی۔

بیل ہونے پر دروازہ کھلا اور ایک نوجوان مردانے جو حلیئے سے اس گھر کا ملازم دکھائی دیتا تھا، اسے دیکھ کر پوچھا۔

"جاوید صاحب؟"

جاوید نے حیرانگی سے اسے دیکھا اور سر اثبات میں ہلا دیا۔

وہ مسکراتے ہوئے بولا۔ "تشریف لائیے۔"

اس کی رہنمائی میں جاوید ڈرائنگ روم میں جا پہنچا۔

"تشریف رکھئے۔" اس نے وسیع و عریض ڈرائنگ روم کے ایک نرم و گداز صوفے پر اسے بیٹھنے کے لیے کہا۔ "میں صاحب کو اطلاع کرتا ہوں۔"

جاوید صوفے پر بیٹھ گیا اور حیرانگی سے ڈرائنگ روم کی آرائش و زیبائش دیکھنے لگا۔

اسے آج نور احمد کی طرف سے چائے کا بلاوا ملا تھا۔ وہ آ گیا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ پارٹی وغیرہ ہو گی۔

لیکن

ایسی کوئی بات نہ تھی۔

وہ کچھ الجھ سا گیا۔ کمرے کا ساز و سامان بیش قیمت آرائشی چیزیں اور نوادرات، پینٹنگز، قالین، جھاڑ فانوس ساری چیزیں تکتے ہوئے سوچ میں ڈوب گیا۔

"ہیلو جاوید۔" نور احمد اپنا پائپ پکڑے اندر آ گئے۔ بڑے تپاک سے اس کا خیر مقدم کیا۔

وہ اٹھتے ہوئے جھجک کر بولا۔ "السلام علیکم سر"

نور احمد نے مصافحے کے لیے ہاتھ بے تکلفی سے بڑھا دیا جسے جاوید نے چھو لیا۔

"بیٹھو۔"

وہ بیٹھ گیا۔ نور احمد بھی اس کے قریب اونچے تکئے والی گدے دار کرسی پر بیٹھ گئے۔

"میں نے آج تمہیں چائے پر بلایا ہے۔" نور احمد پائپ کا کش لیتے ہوئے بولے۔

"صرف مجھے سر؟"

"ہاں۔"

وہ کچھ نہ کہہ سکا۔ خاموش رہا۔ نور احمد بولے۔ "تم مجھے اپنے بچوں ہی کی طرح لگتے ہو۔ بہت خوشی ہوئی کہ تم آ گئے۔"

جاوید کا دل ایک دم دھڑکا۔ اس نوازش کے پس پردہ ضرور کچھ تھا ورنہ یہ لوگ...... وہ جانتا تھا یہ لوگ اپنے ماتحت سے اس طرح بے تکلف نہیں ہوتے۔ اس کے ذہن میں اس رات کا ڈنر لہرا گیا۔

اس پر گھبراہٹ سی طاری ہو گئی۔ کچھ کہنے کو تھا کہ نورینہ اپنی ممی کے ساتھ آ گئی۔

تعظیماً وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

"بیٹھو بیٹے۔" سرخ و سپید بھاری بھرکم سی ممی نے اس کے کندھے پر شفقت سے ہاتھ پھیرا۔

اس نے بیٹھتے ہوئے نورینہ پر نگاہ ڈالی۔ سادہ سے آف وائٹ لباس پر اس نے ہلکے براؤن رنگ کی پتلی سی جرسی پہن رکھی تھی۔ اس کے براؤنش سیاہ بال کھلے تھے اور

چہرے کا سنہرا رنگ دمک رہا تھا۔ اس کی گہری اور بڑی بڑی آنکھوں میں خوشی کے سائے لہرا رہے تھے۔ اس کا جسم متناسب اور قد بڑا موزوں تھا۔ ہاتھ اور پاؤں بھی بڑے خوبصورت تھے۔ ناخنوں پر براؤنش شیڈ کی نیل پالش لگی تھی۔ براؤن بکل لیس سینڈل میں جکڑے اس کے سنہری پاؤں اور نیل شدہ ناخن بڑے خوبصورت لگ رہے تھے۔

وہ اس کے حسن جہانسوز سے کچھ مرعوب سا ہو گیا۔ جانے وہ اتنی حسین تھی بھی یا نہیں...... لیکن وہ اس وقت خاصی حسین لگ رہی تھی۔

ممی نے آتے ہی بے تکلفی سے باتیں شروع کر دیں۔ نورینہ صرف حیرت و اشتیاق سے اسے تک رہی تھی۔

جب ممی تعارف اور اچھی خاصی کیس ہسٹری بیان کر چکیں تو نورینہ نے صرف اسی قدر کہا۔ "ہو بہو اسلم کی طرح ہیں۔"

"اسلم کو بھول جاؤ بیٹے، یہ جاوید ہیں۔ یہ بہت اچھے اور مخلص انسان ہیں، ان سے مل کر تمہیں خوشی ہو گی۔"

"ہاں ہاں ڈیڈی، میں انہیں دیکھ کر ہی خوش ہو گئی ہوں۔ خدا کرے ان کی عادتیں بھی اسلم جیسی ہوں۔"

"پھر اسلم۔"

وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ ممی نے متفکرانہ انداز میں اسے دیکھا۔ جاوید نقرئی گھنٹیوں کی آواز میں گم ہو گیا۔

وہ ہنسی پر قابو پاتے ہوئے بولی۔ "ڈیڈی...... میرے ہنسنے سے بھی آپ فکر مند ہو جاتے ہیں۔ رونے سے بھی...... ہنسوں بھی نہیں، پھر کیا کروں؟"

"باتیں کرو۔"

"جاوید تو بول ہی نہیں رہے۔"

"تم باتیں کرو، وہ جواب دیں گے۔"

"ٹھیک ہے۔"

وہ مسکرا رہی تھی۔

ممی چائے کے لیے اٹھ گئیں۔ نور احمد ٹائمز کی ورق گردانی کرنے لگے۔ نورینہ پہلے جھجکتے ہوئے جاوید سے مخاطب ہوئی لیکن جلد ہی بے تکلفی سے باتیں کرنے لگی۔

جاوید ہوں، ہاں اور کبھی مختصر الفاظ میں اس کی باتوں کا جواب دینے لگا۔

چائے کی ٹرالی آئی تو ممی بھی آگئیں۔ چائے کے لیے خاصا اہتمام کیا گیا تھا اور ممی تو جیسے صدقے واری ہوئی جا رہی تھیں۔ بیٹی کے چہرے پر کھلنے والے مسرتوں کے پھول وہ ہر قیمت پر خریدنا چاہتی تھیں۔

چائے کے بعد ممی ڈیڈی دونوں اٹھ گئے۔

جاوید پر گھبراہٹ مسلط ہو گئی جسے نورینہ نے بھانپ لیا۔ وہ مسکرائی۔

"آپ بہت شائے ہیں۔"

"جی......جی۔" وہ ہکلا گیا۔

"اسلم ایسا نہیں تھا۔ بڑا باتونی تھا۔ کبھی کبھی میں اس کی باتوں سے اکتا بھی جاتی تھی۔"

"ہوں۔"

"آپ باتونی نہیں ہیں۔ یہ اچھی بات ہے، مجھے پسند ہے۔"

جاوید نے گھبرا کر اس کی طرف دیکھا۔

وہ مسکرا دی۔

ملازم ٹرالی واپس لے گیا۔ جاوید چند لمحے کھویا کھویا بیٹھا رہا۔ اسے نورینہ کی نگاہیں اپنے چہرے پر محسوس ہو رہی تھیں۔

"آئیں باہر چلتے ہیں۔" نورینہ بولی۔

"کہاں؟"

"لان میں۔"

"باہر ٹھنڈ ہو گی۔"

"ہاں ہو گی ضرور لیکن موسم بڑا خوبصورت ہے۔"

وہ چند لمحے چپ رہا۔

پھر بولا۔ "اب اجازت چاہوں گا۔"

"کیوں؟" بے ساختہ نورینہ نے کہا۔

"کافی دیر ہو گئی ہے۔ گھر جانا ہے۔"

وہ ہنس پڑی، پھر بولی۔ "آپ تو لڑکیوں کی طرح ڈر رہے ہیں......"

وہ چپ رہا۔

"آپ کو میوزک کا شوق ہے؟" کچھ لمحے توقف کرنے کے بعد نورینہ نے پوچھا۔

"جی......کچھ ہے تو......"

"کچھ سننا پسند کریں گے؟"

اس نے صرف نورینہ کو دیکھا۔ نورینہ اٹھی اور ایک کونے کی خوبصورت سی میز پر رکھے شاندار ڈیک کی طرف بڑھی۔ جاوید بے چینی سی محسوس کر رہا تھا۔ ایک نوجوان لڑکی سے اس طرح گھل مل کر بیٹھنا اور باتیں کرنا اس نے کب سیکھا تھا۔ اس کے ماحول میں تو بیوی سے بھی سب کے سامنے بے تکلفی نہ برتی جا سکتی تھی۔

نورینہ نے ڈیک پر ایک انگریزی گانے کی دھن لگا دی۔ وہ پھر اپنی جگہ پر آ بیٹھی اور جاوید کے چہرے کو بغور دیکھنے لگی۔ شاید وہ اسلم کے تاثرات اس کے چہرے میں ڈھونڈ رہی تھی۔

جاوید نے پھر بے چینی سی محسوس کی۔ کمرے میں انگلش میوزک کا زیر و بم گونج رہا تھا جس کی لے پر نورینہ ہولے ہولے پاؤں ہلا رہی تھی۔

"ویسے آپ کو کون سا میوزک پسند ہے؟" نورینہ نے پوچھا۔ جاوید نے کہا۔

"مشرقی۔"

"اوہ......" نورینہ بولی۔ "پہلے بتا دیتے۔ بہت اچھی اچھی کیسٹیں ہیں......"

وہ پھر اٹھ کر ڈیک کی طرف گئی۔

چند لمحوں بعد کمرے میں ستار پر راگ بہاری کی خوبصورت آواز لہرا رہی تھی۔

جاوید کی رگ شوق پھڑک اٹھی اور وہ پوری دلچسپی سے ستار کا کیسٹ سننے لگا۔

نورینہ بار بار اسے تک رہی تھی۔ اس تکنے میں نگاہوں کی گرمجوشی شامل تھی جس سے جاوید گھبرا جاتا تھا۔

کچھ دیر دونوں کیسٹ سنتے رہے۔ نورینہ بولی۔ "میوزک میں بھی آپ کا ٹیسٹ اسلم سے مختلف ہے۔ وہ تو ڈسکو میوزک کا دیوانہ تھا۔"

جاوید نے نگاہ بھر کر اسے دیکھا۔

وہ پھول کی طرح کھل گئی۔ مسکرا کر بولی۔ "ڈسکو میوزک مجھے قطعاً پسند نہیں لیکن اسلم کی خاطر۔"

"اب اجازت دیجیے۔" جاوید اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ نورینہ کی بات ادھوری چھوڑ کر کھڑا ہو گیا۔ نورینہ بھی اٹھ کھڑی ہوئی۔

"پھر کب آئیں گے؟" نورینہ بولی۔

جاوید نے کوئی جواب نہ دیا اور کمرے سے باہر جانے لگا۔

"میں انتظار کروں گی۔" اس نے اس کے ساتھ ساتھ قدم اٹھاتے ہوئے کہا۔

وہ کچھ نہیں بولا۔

دونوں باہر آ گئے۔

"خدا حافظ۔" جاوید نے اس کی طرف دیکھے بغیر کہا اور تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا گیٹ کی طرف آ گیا جہاں اس کا سائیکل تھا۔

شام اتر آئی تھی۔ سردی کچھ بڑھ رہی تھی۔ جاوید گرم کمرے سے باہر نکلا تھا۔ اس لیے کپکپاہٹ سی محسوس ہوئی۔ سائیکل کا تالا کھولتے ہوئے اس نے دزدیدہ نظروں سے دیکھا۔ پورچ میں نورینہ کھڑی اسے ہی تک رہی تھی۔

جاوید کو اس نے ہاتھ ہلایا......جواباً اسے بھی ہاتھ ہلانا پڑا۔ وہ سائیکل گھسیٹ کر گیٹ سے باہر آ گیا۔ اتنی بڑی کوٹھی سے پرانی سائیکل پر بیٹھ کر جاتے ہوئے اسے کچھ عجیب سا لگا۔

جاوید الجھا الجھا سا تھا۔ اسے لگتا تھا کوئی جال پھیلا ہے اور اس میں اسے جکڑنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ گو چائے پر بلانا ایک دوستانہ فعل ہے۔

لیکن

نورینہ کے حالات جانتے ہوئے یہ دوستانہ دعوت بنا مقصد کے نہ لگتی تھی۔

پھر

اس کا اور نور احمد کی فیملی کا جوڑ ہی کیا تھا۔ شہر کے جانے پہچانے امراء میں شمار ہونے والے لوگ اتنا جھک آئے تھے کہ دفتر کے معمولی سپروائزر کو اپنے دوستوں کی فہرست میں شامل کر رہے تھے۔

وہ بوکھلایا بوکھلایا سا تھا۔ نورینہ جیسی خوبصورت اور شائستہ لڑکی کے ساتھ کچھ وقت گزارنا اُسے بُرا بھی نہیں لگا تھا۔

لیکن یہ عمل بار بار دہرانے میں جو قیامت تھی، وہ ابھی سے بھانپ گیا تھا۔

ایک لمحہ کو اس کے دل میں یہ شیطانی خیال بھی آیا تھا کہ کاش وہ شادی شدہ نہ ہوتا۔

لیکن دوسرے لمحے ہی ضمیر نے کچوکا دیا تھا اور وہ اپنے آپ سے شرمسار ہو گیا تھا۔

وہ کھویا کھویا رہنے لگا تھا۔ ہر وقت سوچوں میں گم...... بیوی اور بچی جو اس کی زندگی کا اہم حصہ تھے۔ جو اس کے بغیر کچھ بھی نہ تھے۔ اس الجھاؤ کو کیسے محسوس نہ کرتے۔

اس دن فاخرہ چولہے کے پاس بیٹھی روٹیاں پکا رہی تھی۔ چوکی پر جاوید بیٹھا تھا۔ اس کی گود میں بے بی تھی جو اپنی معصوم باتوں سے اسے مخاطب کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔

جاوید کی نظر فاخرہ کے ہاتھوں پر گئی۔ اس کے ہاتھ گورے تھے لیکن نفاست و نزاکت جو نورینہ کے ہاتھوں میں تھی، یہاں اس کا فقدان تھا۔ غیر شعوری طور پر دونوں کے ہاتھوں کا موازنہ کرتے ہوئے وہ بولا۔ "تم براؤن شیڈ کی نیل پالش کیوں نہیں لگاتیں۔"

اس نے مسکرا کر جاوید کی طرف دیکھا۔ پھر روٹی توے پر ڈال کر اپنے ہاتھوں کو دیکھ کر بولی۔ "ان ہاتھوں پر نیل پالش کیا ٹھہرے گی۔ براؤن ہو یا ریڈ۔"

"کیوں؟"

"چوبیس گھنٹے تو برتن دھونے، کپڑے دھونے، آٹا گوندھنے کا کام کرنا ہوتا ہے۔"

وہ چپ ہو گیا۔

فاخرہ نے ہنس کر کہا۔ "کیوں آج نیل پالش کا خیال کیونکر آ گیا؟"

وہ گھبرا کر بولا۔ "کچھ نہیں، کچھ نہیں۔"

پھر

اس دن اسے تنخواہ ملی تو وہ فاخرہ کے لیے آف وائٹ سوٹ اور براؤن جرسی لے آیا۔ ان چیزوں کی خرید کا عمل جیسے خود بخود ہو گیا تھا۔

فاخرہ نے چیزیں دیکھتے ہی کہا۔ "اللہ، اتنے پیسے خوامخواہ خرچ کر آئے۔ آپ کو پتہ بھی ہے۔ کتنی اور چیزیں بنانی ہیں۔"

اس کا اشارہ آنے والے بچے کی چیزوں سے تھا۔

فاخرہ نے دیکھا، اس بات پر وہ خوش نہیں ہوا۔ گم صم سا ہی رہا۔

وہ پریشان ہو کر بولی۔ "کیا بات ہے جاوید۔ آپ ان دنوں کچھ پریشان رہتے ہیں؟"

وہ چپ رہا، پھر بولا۔ "کچھ بھی نہیں۔"

"کچھ تو ہے۔"

"ہاں ہے۔"

"کیا؟"

"کچھ نہیں۔" وہ ہنس پڑا۔

پھر فاخرہ کے بار بار پوچھنے پر بولا۔

"آج مجھے ترقی ملی ہے۔"

"واقعی؟" وہ حیرانگی سے اسے تکنے لگی۔

"ہاں...... میں جانتا تھا کہ ترقی ملے گی...... لیکن کیوں ملی ہے؟"

"کیوں ملی ہے؟ کام اچھے کرتے ہوں گے۔"

"اتنی جلدی جلدی ترقی ملی تو ایک سال ہی میں منیجر کے عہدے تک پہنچ جاؤں گا۔"

"خدا کرے، محنت رنگ ہی تو لاتی ہے۔ اتنی ایمانداری سے محنت کر رہے ہیں۔ پھل ملتا ہی ہے۔"

اور وہ صرف فاخرہ کو دیکھ کر رہ گیا۔ اسے بھنک بھی پڑ جاتی تو اس کی حسین سی دنیا تہس نہس ہو جاتی۔

وہ اپنے آپ کو چور سا محسوس کرنے لگا۔

فاخرہ کو اس نے نورینہ کے متعلق کچھ بھی نہیں بتایا تھا لیکن بتاتا بھی کیا؟ یہی تو ادھیڑ بن تھی۔

جاوید ہنس دیا۔ نورینہ پوری آنکھیں کھول کر اسے دیکھنے لگی۔ اسے شاید جاوید کی ہنسی بالکل اسلم کی سی لگی تھی۔

چائے کے دوران دونوں باتیں کرتے رہے۔ بالکل رسمی سی باتیں۔

چائے کا بل جاوید نے پے کرنا چاہا لیکن وہ بولی۔ "آج آپ میرے مہمان ہیں۔ جب آپ مجھے دعوت دیں گے تو بل آپ ہی پے کریں گے۔"

چائے کے بعد دونوں باہر آگئے۔ شام اتر رہی تھی۔

"شام ہونے کو ہے۔" جاوید نے جیسے گھبرا کر کہا۔ اسے فاخرہ کا خیال آگیا۔ وہ اس کا انتظار کر رہی ہو گی۔

"سرمائی دن بہت چھوٹے ہوتے ہیں۔" نورینہ بولی۔ "ایک دم ہی ڈوب جاتے ہیں اور تاریکی پھیل جاتی ہے۔ مجھے تاریکی سے سخت وحشت ہوتی ہے۔"

جاوید نے دیکھا، وہ کچھ کچھ ابنارمل لگنے لگی تھی۔

لیکن

یہ شاید جاوید کا وہم تھا۔

وہ اس سے باتیں کرتا گاڑی تک آیا۔

نورینہ گاڑی کا دروازہ کھولتے ہوئے مسکرا کر بولی۔ "آپ کے سائیکل کا پرابلم نہ ہوتا تو میں آپ کو ڈراپ کر دیتی۔"

"شکریہ۔"

وہ گاڑی میں بیٹھ گئی۔ جاوید نے خدا حافظ کہا۔

"اب کب..... مجھے دعوت دے رہے ہیں۔" گاڑی سٹارٹ کرتے ہوئے نورینہ نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

ان آنکھوں میں کیسا جادوئی اثر تھا۔ جاوید اندر ہی اندر کانپ گیا۔ وہ نورینہ کی بات کا جواب نہ دے سکا۔

وہ اک ادائے دلربائی سے اس پر شوخ نگاہ ڈال کر بولی۔ "بہت کنجوس لگتے ہیں۔"

جاوید گڑبڑا گیا۔

نورینہ جیسے اپنے آپ سے بولی۔ "یہ بھی فرق ہے آپ میں اور اسلم میں...... وہ بڑی فراخدلی سے خرچ کرنے کا عادی تھا......"

جاوید آہستگی سے بولا......"آپ جب چاہیں میری طرف سے دعوت قبول کر لیں۔"

"کھانا کھلائیں گے یا......؟"

"جو آپ کی مرضی۔"

"ہلٹن میں کھانا ہو جائے؟"

"ضرور......"

"کب؟"

"کل......؟"

"ٹھیک ہے۔"

"لیکن......"

"کیا؟"

"لنچ یا ڈنر؟"

"اپنے ڈیڈی سے چھٹی لے دیں تو لنچ پہ آجایئے گا۔"

"اوہ چھٹی...... کی کوئی بات نہیں۔ ڈیڈی کو کہہ دوں گی۔"

"بہتر۔"

"پھر ہو گیا طے؟"

"جی۔"

وہ مسکرائی اور بولی۔

"اتنی کسر نفسی سے کام نہ لیا کریں۔"

"جی؟"

"ہر بات میں جی جی مجھے پسند نہیں۔"

"جی؟"

وہ بے اختیارانہ بولا تو نورینہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ وہ بھی کھسیانہ ہو کر مسکرا دیا۔

خدا حافظ کے تبادلے کے بعد وہ گاڑی نکال لے گئی۔

جاوید آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا سائیکل سٹینڈ کی طرف آگیا۔

نورینہ بے حد خوش تھی۔ ممی اور ڈیڈی اسے خوش دیکھ کر پھولے نہ سماتے تھے۔ اس کی خوشی کا راز جانتے تھے۔ اسی لیے نور احمد نے جاوید پر مراعات اور نوازشوں کی ابتداء کر دی تھی۔ اسے ترقی دے دے کر اوپر ہی اوپر لانے کا سوچ رہے تھے۔ نورینہ کی خوشیوں کی خاطر یہ سودا مہنگا نہیں تھا۔

اس دن نورینہ نے خوبصورت سا لباس پہنا۔ بالوں کو نئے انداز سے سنوارا......اب ایک عرصے بعد وہ اپنی ذات اور اپنی شخصیت پر دھیان دینے لگی تھی۔

آج اس نے جاوید کو گھر پر کھانے کی دعوت دی تھی۔ وہ اپنے ہاتھ سے دو تین ڈشیں بنا کر کچن سے نکلی تھی اور اب تیار ہو کر جاوید کے انتظار میں بیٹھی تھی۔

ممی ڈیڈی کلب جا رہے تھے۔ ان کے کسی مشترکہ دوست کی طرف سے کھانا دیا گیا تھا۔ کھانا نہ بھی ہوتا تو بھی شاید وہ کوئی اور پروگرام بنا لیتے۔ جاوید اور نورینہ کو قریب آنے کے لیے وہ خود بھی تو موقع فراہم کرتے تھے۔

نورینہ نے بڑے اصرار سے جاوید کو آج رات کے کھانے کے لیے مدعو کیا تھا۔

اس نے کترانے کی کوشش کی تھی۔

تو

نورینہ روٹھ گئی تھی۔ جاوید کو ڈر لگا تھا۔ کہیں وہ ناراض ہو کر اپنا نروس بریک ڈاؤن نہ کر لے۔

"آجاؤں گا۔" وہ جلدی سے بولا تھا۔

نورینہ کی آنکھوں میں چمک ابھر آئی تھی۔ وہ بے اختیارانہ بولی تھی۔ "تم بہت اچھے ہو۔ بہت ہی اچھے...... میں نے اسلم کو مس کرنا چھوڑ دیا ہے۔"

جاوید اس کی بات سے گھبرا گیا تھا۔

لیکن

دعوت قبول کر لی تھی۔ اس لیے رات آنا ہی پڑا۔

دعوت پُر تکلف تھی۔ نورینہ مختلف ڈشیں اسے پیش کر رہی تھی۔ اس کی خوشیوں کا ٹھکانہ نہیں تھا۔

وہ بے اختیار ہوئی جا رہی تھی۔ کھانے کے بعد جب دونوں ٹی وی کے سامنے آبیٹھے تو نورینہ بڑے جذباتی انداز میں بولی۔ "میں تمہاری ممنون ہوں جاوید۔ تم نے مجھے نئی زندگی دی ہے۔"

وہ آہستگی سے بولا۔ "میں آپ کے کسی کام آسکا، مجھے اس بات سے خوشی ہوئی ہے۔"

نورینہ نے اک ادائے دلبرائی سے اسے دیکھا اور مسکرا کر بولی۔ "آپ بہت اچھے ہیں۔"

"شکریہ۔"

ٹی وی پر کوئی انگریزی فلم چل رہی تھی۔ جاوید اس میں دلچسپی نہیں لے رہا تھا۔ ویسے بھی کافی وقت ہو گیا تھا۔ اس نے جانے کی اجازت چاہی۔

"بہت جلدی ہوتی ہے آپ کو جانے کی۔" وہ بولی۔

"ہاں رات کافی ہو گئی ہے اور مجھے دور جانا ہے۔"

"ڈرائیور چھوڑ آئے گا۔"

"نہیں شکریہ۔"

"تکلف کیوں کرتے ہیں۔ آپ کی یہ عادت اچھی نہیں...... بالکل غیروں کی طرح ہوتا ہے آپ کا رویہ۔"

جاوید کا دل دھک دھک کرنے لگا۔ نورینہ نے جس اپنائیت اور محبت

بھرے شکوے سے یہ بات کی تھی، وہ محسوس کر کے تھرا گیا۔

اور

شاید

پہلی بار اسے اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ وہ جس راہ پر چل رہا تھا، یہ راہ اس کی متعین راہ سے مخالف سمت جا رہی تھی۔ اس کا ضمیر چیخ اٹھا۔ اسے یوں لگا جیسے وہ اپنی عزیز ترین بیوی اور بچی کی حق تلفی کر رہا ہے۔ وہ نورینہ کے ساتھ مراسم بڑھا کر صحیح راہ سے بھٹک رہا ہے۔ وہ اک شوہر ہے، اک باپ ہے۔ اس کا ایک پر سکون گھر ہے۔ اسے نورینہ سے دوستانہ مراسم بھی بڑھا کر بہت بڑی قیمت ادا کرنا پڑے گی۔

اسے یوں لگا جیسے وہ اب تک اپنے آپ کو فریب دیتا رہا ہے۔ نورینہ کے جذبات کو سمجھتے ہوئے بھی اس کے قریب آ رہا تھا۔

اسے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔

اس کے من میں شور سا مچ گیا

نورینہ جانے کیا کہہ رہی تھی، محبتیں نچھاور کر رہی تھی کہ وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

اور

اس کے اصرار پر بھی نہیں رکا۔

وہ یہاں سے بھاگ جانا چاہتا تھا۔ ایسی جلتی قربتوں سے فرار حاصل کرنا چاہتا تھا۔

اس نے تہیہ کر لیا کہ اب نورینہ سے کبھی نہیں ملے گا۔

نور احمد صاحب نے بھی بلایا تو کبھی ان کے کہنے پر بھی نورینہ سے ملنے نہیں آئے گا۔

دامن آگ کی لپیٹ میں آنے سے پہلے ہی وہ دامن سمیٹ لینا چاہتا تھا۔ وہ نورینہ کو خوشیاں دینے کے لیے اپنی محبوب بیوی کی جھولی میں انگارے نہیں بھر سکتا تھا۔ اپنی بچی کے لیے مسائل کی آگ نہیں بھڑکا سکتا تھا۔

نورینہ اسے روکتی ہی رہ گئی۔

سڑک کے کنارے ایک لڑکی سے یوں باتیں کرنا ٹھیک نہیں تھا۔ اس کے اصرار پر وہ گاڑی میں بیٹھ گیا۔ نورینہ نے گاڑی چلا دی۔ وہ اس سے اتنے دنوں سے غائب ہو جانے کا شکوہ کرنے لگی۔

جاوید قدرے مضطرب ہوا۔ وہ باتیں کیے گئے۔

اور باتوں ہی باتوں میں گاڑی شہر کی حدود سے باہر آ گئی۔ نہ ہی جاوید نے گھر کا پتہ بتایا اور نہ ہی نورینہ نے پوچھا۔ برج پار کرنے پر وہ خود ہی بولی۔

"اوہ...... ہم کہاں جا رہے ہیں؟"

جاوید بھی چونکا...... "ہم بہت دور نکل آئے ہیں۔ واپس چلیے......"

وہ مسکرائی...... "مجھے لمبی ڈرائیو کا جنون کی حد تک شوق ہے جاوید۔ کیا آپ کو بھی ہے؟"

جاوید ہمت کر کے بولا۔ "معاف کیجئے گا مس نورینہ۔ میرا تعلق اس طبقے سے نہیں جو اپنی پسند سے زندگی کے کینوس پر رنگ پھیلاتا ہے۔"

"یعنی......" وہ ادائے دلربائی سے مسکرائی۔

"میں ایک محنت کش آدمی ہوں اور روٹی کمانے کے علاوہ کوئی اور شغل اختیار کرنے یا کوئی شوق پالنے کی استطاعت ہی نہیں۔"

"میں جانتی ہوں۔" وہ مسکرائی۔

"ہوں۔" جاوید چپ ہو گیا۔

"ڈیڈی آپ کے لیے بہت کچھ کر رہے ہیں......" وہ شوق سے اسے تکتے ہوئے بولی۔

جاوید نے تڑپ کو نورینہ کی طرف دیکھا۔ وہ مسکرائی۔ "میری خاطر وہ بہت کچھ کریں گے۔"

"مس نورینہ۔" جاوید سنبھلتے ہوئے بولا۔

"ہوں۔"

"آپ کو میرے بارے میں شاید کچھ بھی معلوم نہیں۔"

"اتنا تو معلوم ہے کہ آپ شریف انسان ہیں اور میں آپ کے وجود میں اسلم کا سراپا فٹ کر لوں گی۔"

"نورینہ۔"

"جی۔"

"میں...... آپ کی کوئی خدمت نہیں کر سکوں گا۔"

"اوہ جانے دو جاوید...... میرے لیے یہی تسکین کافی ہے کہ مجھے اسلم کا بدل مل جائے۔"

"نہیں مس نورینہ...... نہیں مل سکتا۔"

نورینہ کے ہاتھوں کی گرفت وہیل پر سخت ہو گئی۔ گاڑی کو ایک جھٹکا سا لگا۔ حیران ہو کر اس نے جاوید کی طرف دیکھا جو بے حد پریشان تھا۔

"میں...... میں......" وہ ہکلایا۔

"آپ کیا کہنا چاہتے ہیں۔ کیا ممی ڈیڈی نے کھل کر بات نہیں کی۔ ان پر اپنی رضامندی ظاہر نہیں کی؟"

وہ حیران ہو کر اسے دیکھنے لگا۔

نورینہ بولی۔ "میرے ممی ڈیڈی تم سے پرامید ہیں...... میرے خیال میں تم...... تم......"

"میں کچھ نہیں کر سکتا مس نورینہ...... میں شادی شدہ ہوں اور ایک پھول سی بچی کا باپ ہوں۔ بخدا میرا گھریلو سکون تباہ نہ کیجئے۔ میں آپ کے کسی کام نہیں آ سکتا۔ آپ کو کسی مغالطے میں نہیں رکھنا چاہتا۔"

نورینہ کا رنگ فق ہو گیا۔ ایک جھٹکے سے اس نے گاڑی روک لی۔ شاید وہ گاڑی پر کنٹرول نہ کر پائی تھی۔ اس نے اسٹیئرنگ پر سر رکھ دیا۔

جاوید پریشان تو ہوا لیکن اس کے ذہن سے بہت بڑا بوجھ اتر گیا۔ وہ چند لمحے چپ رہا۔

پھر بولا۔ "مس نورینہ! میں معذرت خواہ ہوں۔ آپ کو صدمہ پہنچانا مقصود

نہیں تھا لیکن میری پوزیشن بھی دیکھئے۔ میری بیوی ہے، بچی ہے اور میں اپنے حالات سے مطمئن ہوں۔ بڑی آسودہ زندگی گزر رہی ہے۔"

اس نے آہستہ آہستہ سر اٹھایا اور دکھ سے بولی۔ "کاش تم پہلے ہی سب کچھ بتا دیتے۔"

"مجھے صفائی کا موقع ہی نہیں دیا گیا۔" وہ جلدی سے بولا۔

نورینہ کا چہرہ کملا گیا۔ دکھ کے سائے اس کی آنکھوں سے جھلکنے لگے۔ مایوس و محروم ہو کر اس نے ایک دکھ بھری سانس لی۔

"بس نورینہ، پلیز نارمل رہیے گا۔ میں آپ کی کوئی خدمت نہیں کر سکتا، مجھے افسوس ہے لیکن آپ خود سوچئے۔ آپ کو احساس ہونا چاہیے کہ محبت بھرے دل کیسے ہوتے ہیں۔ آپ اسلم کو اب تک ڈھونڈتی پھر رہی ہیں۔ یہ آپ کی بے پناہ محبت ہے۔ آپ بچھڑے ہوئے کو پانے کی کوشش میں سرگرداں ہیں۔ میں ملے ہوؤں سے کیسے بچھڑ جاؤں۔ سوچئے مس نورینہ...... میں اپنی بیوی، اپنی بچی اور اپنے پُرسکون گھر کو کیسے تباہ کر لوں؟"

"آپ ٹھیک کہتے ہیں...... سوری......" وہ چند لمحے چپ رہی، پھر بے تعلقی سے پوچھا۔ "آپ کا گھر کہاں ہے۔ رستہ بتاتے جائیے، میں آپ کو ڈراپ کر دوں گی۔"

جاوید کو دکھ بھی ہوا...... ایک دکھی لڑکی کو اور دکھ پہنچا تھا...... زود رنج جاوید کے لیے یہ دکھ کی بات تھی لیکن وہ کر بھی کیا سکتا تھا۔

جاوید نے سوائے رستہ بتانے کے اور کوئی بات نہ کی۔

نورینہ نے اسے گلی کی نکڑ پر اتارا...... جاوید کا دوسرا گھر ہی تو تھا۔ وہ اسے خدا حافظ کہہ کر گاڑی سے اتر گیا۔ نورینہ نے گاڑی ریورس کی۔ پھر بنا کچھ کہے گاڑی نکال لائی۔

وہ ایک بار پھر ٹوٹ پھوٹ گئی تھی۔

نورینہ بستر میں اوندھی پڑی تھی۔ چہرہ تکیئے میں چھپایا ہوا تھا۔ دن کافی نکل آیا تھا۔ وہ پہلے بھی دیر ہی سے اٹھنے کی عادی تھی لیکن آج تو معمول سے کہیں زیادہ دیر ہو گئی۔ نور احمد کام پر چلے گئے۔ نوید اور سعید کالج جا چکے تھے۔

ممی گھر کو ٹھیک ٹھاک کرنے میں گھنٹہ بھر مصروف رہی تھیں۔ آج بھنگن سے صفائی بھی انہوں نے خود ہی کروائی۔ رات کافی لوگ آئے ہوئے تھے۔ اس لیے سارا ڈرائنگ روم اپ سیٹ تھا۔

وہ کام سے فارغ ہو کر نہانے چلی گئیں۔ گرم پانی کے شاور تلے وہ گرم پانی کے ہاتھ سے اپنے جسم کی سستی دور کرنے کی کوشش کرتی رہیں۔ سردیوں میں گرم پانی وافر مقدار میں مل سکتا تھا، اس لیے وہ دیر تک غسل لیا کرتیں۔

تازہ دم ہو کر باہر نکلیں تو دس بج چکے تھے۔ انہیں نورینہ کا خیال آ گیا۔

"نورینہ نہیں جاگیں ابھی تک؟" انہوں نے لابی میں جھاڑ پونچھ کرتی گلزار سے پوچھا۔

"جاگی ہوئی ہیں۔"

"تو کہاں ہے؟"

"اپنے کمرے میں ہیں۔"

"چائے وائے پی لی؟"

"نہیں۔"

"کیوں؟"

"کچھ بولتی ہی نہیں۔ میں دوبار چائے کا پوچھنے گئی۔"

"او کم بخت پہلے کیوں نہیں بتایا۔" ممی پریشان ہو کر بولیں۔ اپنے تراشیدہ بالوں میں برش چلاتے ہوئے بولیں۔ "اس کی طبیعت تو ٹھیک ہے ناں۔ رات میں اسے دیکھنے گئی تو وہ سو چکی تھی۔"

"پتہ نہیں جی۔ بس بستر میں اوندھی لیٹی ہیں۔ میں نے چائے کا پوچھا تو سر ہلا کر نہ کر دی۔"

ممی کو خیال آیا کہ کل شام جب وہ لوٹی تھی تو نڈھال سی تھی۔ چہرے کی رنگت اڑی اڑی سی تھی۔ رات اس نے کھانے میں بھی شرکت نہیں کی تھی اور مہمانوں کی وجہ سے ممی اٹھ کر اسے دیکھنے بھی نہ گئی تھیں۔ نوید اور سعید ہی اس کے پاس گئے تھے۔ جب ممی اور ڈیڈی نے پوچھا تو وہ بولے تھے۔ "ٹھیک ٹھاک ہیں۔ سست ہو رہی ہیں، کہتی ہیں ریسٹ کروں گی۔"

وہ مطمئن ہو گئے تھے۔ اس طرح کے مہمان گھر میں اکثر آتے رہتے تھے۔ نورینہ نے ان کی صحبت میں کبھی شرکت نہیں کی تھی۔

رات گئے ممی اسے دیکھنے گئی تھیں تو کمرے کی لائٹیں آف تھیں اور نورینہ لحاف میں دبکی ہوئی تھی۔ وہ دبے پاؤں واپس نکل آئی تھیں۔ مبادا اس کی آنکھ کھل جائے۔

اب گلزار کی زبانی یہ بات سنی تو متفکر ہو گئیں۔ بالوں میں برش کرتے ہوئے اسے ہر چیز اچھی طرح جھاڑ پونچھنے کی تاکید کی اور خود نورینہ کے کمرے کی طرف بڑھیں۔

"نوری...... نور بیٹی......" وہ کمرے میں آتے ہی بولیں۔ نورینہ اب بھی اوندھی پڑی تھی اور شدت اضطراب سے پاؤں پر رکھا پاؤں ہلا رہی تھی۔

ممی کی آواز پر اس نے پاؤں ہلانا بند کر دیا۔ ان کی بات کا اس نے کوئی جواب نہ دیا۔

وہ قریب آ کر بیڈ کے کنارے پر بیٹھ گئیں اور پیار سے نورینہ کے بالوں میں

ہاتھ پھیرتے ہوئے بولیں۔ "اٹھو میرے لال، دیکھو تو دن کتنا نکل آیا ہے۔ سارا کمرہ روشنی اور دھوپ سے بھر گیا ہے۔"

"نہیں ممی...... نہیں" اس نے سر اٹھایا اور پھر تکیئے پر پٹخ دیا۔

"نورینہ" ممی گھبرا کر بولیں۔ "کیا ہوا...... خیر تو ہے۔ اٹھو تو......"

"نہیں۔"

"نورینہ۔"

"مجھے چھوڑ دیں ممی، چھوڑ دیں۔"

"کیا ہو گیا ہے تمہیں۔ کچھ بتاؤ بھی۔ تم جانتی ہو، تمہاری تکلیف ہماری تکلیف ہے۔ تمہیں دکھی دیکھ کر ہم کتنے دکھی ہو جاتے ہیں۔"

"سکھ میرے نصیب میں نہیں ہیں ممی۔ میں خوامخواہ ہی انہیں پکڑنے کی کوشش کرتی ہوں۔ ہوا میں اندھوں کی طرح ہاتھ چلانے سے کچھ پکڑا نہیں جا سکتا۔"

ممی نے اک گہری سانس لی۔ انہیں اطمینان بھی ہوا کہ نورینہ ہوش و حواس میں ہے۔

وہ اسے پیار کرتی رہیں، چمکارتی رہیں۔ بڑی مشکلوں سے اسے بستر میں بٹھایا۔ خود اس کے تکیئے کے پاس بیٹھ گئیں اور اس کے سر کو اپنی چھاتی سے لگاتے ہوئے بولیں۔ "ہوا کیا ہے...... کچھ تو بتاؤ؟"

پیار اور دلاسے نے ہمت بڑھائی۔

نورینہ نے کل شام کا واقعہ معہ اذیت انگیز انکشاف کے ممی کے گوش گزار کر دیا۔

"جاوید شادی شدہ ہے؟" وہ حیرانگی سے بولیں۔

"ہاں اس کی بچی بھی ہے۔"

"ہوں۔"

"اور وہ اپنی بیوی، بچی اور اپنے گھر سے ٹوٹ کر محبت کرتا ہے۔ وہ میری خاطر کوئی ایسا قدم نہیں اٹھا سکتا جو اس کی گھریلو فضا پر اثر انداز ہو۔"

ممی چُپ ہو گئیں۔

وہ بولی۔ "آپ نے مجھے غلط تاثر کیوں دیا تھا...... کیوں دیا تھا ممی؟" وہ ماں کے کندھے پر سر رکھ کر سسکنے لگی۔

"ہمیں خود پتہ نہیں تھا۔" وہ بڑے دُکھ سے بولیں۔ "ہم نے تو صرف تمہیں خوش دیکھنے کے لیے اسے گھر پر بُلایا تھا۔"

"خوشیاں چھینی نہیں جاسکتیں ممی۔ میں ازلی بدقسمت ہوں۔"

"میرے ہاتھ کبھی کچھ نہیں آئے گا۔"

"مایوسی کی باتیں نہیں کرتے۔"

وہ تلخی سے ہنسی...... ممی نے اسے اپنے ساتھ لگا کر تھپکایا۔ انہیں ڈر تھا، کہیں اس صدمے سے وہ پھر حواس نہ کھودے۔

"چائے پینا پسند کرو گی؟" ممی نے بات بدلی۔

"نہیں۔"

"تو چلو اٹھو۔ تیار ہو کر باہر نکلو، ناشتہ تو کر لو۔"

اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔

"ممی۔" نورینہ نے چند لمحوں بعد کہا۔

"ہوں۔"

"میں اتنی بدقسمت کیوں ہوں؟"

"نور......"

"ممی میں نے جس شاخ کی طرف ہاتھ بڑھایا...... اسی پر بجلی گری۔"

"ایسی باتیں کرنے سے کیا حاصل؟"

"دل کا بوجھ ہلکا ہو جاتا ہے ممی...... ایسی باتیں نہ کیں تو میرا دل پھٹ جائے گا۔"

وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ ممی نے اسے چپ نہیں کرایا۔ کُھل کر رونے سے طبیعت ہلکی ہو جاتی ہے۔ یہ اک فطری اور قدرتی عمل ہے۔ وہ خود بھی چپکے چپکے آنسو

بہانے لگیں۔ واقعی ان کی بچی بدقسمت تھی۔ جاوید ہی کے متعلق وہ خود بھی کتنی بڑی خوش فہمی میں مبتلا ہو گئی تھیں۔ انہوں نے تو شادی کا بھی پلان بنا لیا تھا۔ وہ چٹ منگنی پٹ بیاہ کرنے والی تھیں۔

جاوید کو جلدی جلدی ترقی دے کر افسرانہ سیٹ تک پہنچانے کا بھی انہوں نے ہی نور احمد سے کہا تھا۔ اب اپنی حماقت پر پچھتاوا بھی آرہا تھا اور اپنی بچی کے اس نئے دکھ پر ذہنی اذیت بھی ہو رہی تھی۔

نورینہ رو دھو کر چپ ہو گئی۔ اس کے دُبلے پتلے وجود کو اب بھی کسی کسی سسکی پر جھٹکا لگ رہا تھا۔

فاخرہ جاوید کو ہر وقت الجھا الجھا دیکھتی تو سوچوں میں ڈوب جاتی۔ ان دنوں تو وہ خاصا چڑچڑا ہو گیا تھا۔ وہ کچھ نہ سمجھ پاتی تھی کہ ایسا کیوں ہے۔ اسے دنوں میں ہی اتنی ترقی ملی تھی کہ وہ سوچ بھی نہ سکتی تھی کہ ایسا کبھی ہو گا لیکن جاوید اکاؤنٹس افسر بن کر بھی جھنجلایا ہوا رہتا تھا۔

یہ جھلاہٹ اس کے دوست جو اب اس کے ماتحت تھے، محسوس کرتے تھے لیکن اس نے دل کا حال کبھی کسی سے نہیں کہا تھا۔ تینوں اس کی قسمت پر رشک کرتے تھے۔

رشک فاخرہ کو خود اپنی قسمت پر آتا تھا۔ وہ اپنے آپ کو کتنا اونچا، کتنا باوقار اور کتنا پُراعتماد سمجھنے لگی تھی۔ پیسے میں واقعی بڑی طاقت ہوتی ہے۔ فاخرہ کے بہت سے دلدّر خود بخود مٹ گئے تھے۔

لیکن

جاوید کا الجھاؤ اسے پریشان کر دیتا تھا۔

وہ بازار سے آئی تو مختلف لفافے اس کے ہاتھ میں تھے۔ اب وہ اکثر شاپنگ کے لیے بازار چلی جاتی۔ گھر میں بے بی کو چھوڑ جاتی۔ کبھی سامنے والی ہمسائی کی لڑکی کو اس کے پاس چھوڑ جاتی۔ کبھی بغلی گھر والی بی اماں کو تھوڑی دیر بے بی کا دھیان رکھنے کا کہہ کر گھر بٹھا جاتی۔

دو کمروں کے مکان کو اب اس نے ایک نئی شکل دینے کا تہیہ کر لیا تھا۔ ایک کمرہ، ڈائننگ روم اور دوسرا بیڈ روم بنانا تھا۔ بیڈ روم میں شادی کے دو پلنگ تو تھے ہی،

ڈرائنگ روم میں اکثر دو ٹوٹی پھوٹی کرسیاں، میز اور کھری چارپائیاں پڑی ہوتی تھیں۔ پچھلے ماہ اس نے سیکنڈ ہینڈ صوفہ خریدا تھا۔ فالتو سامان وہاں سے اٹھا لیا تھا۔ آج وہ لنڈے سے پردے لینے گئی ہوئی تھی۔ فوم کے کشن اور بے بی کے فراکوں کا کپڑا بھی خرید لائی تھی۔ لنڈے سے اسے ایک بالکل نئی پتلون بھی ملی تھی۔ وہ جاوید کے لیے خرید لائی تھی۔۔ ماپ بالکل اسی کا تھا، یوں لگتا تھا، اسی کے لیے بنائی گئی ہے۔ اس کے پاس پل اوور تھا۔ اس پتلون کے ساتھ خوب جچ سکتا تھا۔ اسے جاوید کے لباس کا بھی اب خیال رہتا تھا۔

لیکن اور چیزیں بھی ضروری تھیں۔ اس لیے لنڈے سے ہی کام چل جاتا تھا۔

وہ چیزیں خرید کر گھر آئی۔ لدی پھندی اندر آئی تو جاوید دفتر سے آچکا تھا۔

اس نے ساری چیزیں برآمدے میں رکھ دیں اور بی اماں کا شکریہ ادا کرتے ہوئے بولی۔ "مجھے ذرا دیر ہو گئی۔ جاوید آگئے تھے، آپ چلی جاتیں۔"

بی اماں کو رخصت کر کے وہ کمرے میں آئی تو جاوید جوتوں سمیت پلنگ پر اوندھا پڑا تھا۔

وہ پریشان ہو گئی۔ جلدی سے اس پر جھک کر بولی۔ "جاوید۔" بے بی ماں کی آواز پر دوسرے کمرے سے بھاگی آئی...... "کیا لائی ہیں امی؟"

"بہت کچھ۔" اس نے بچی کو پیار کرتے ہوئے کہا۔ بچی کچھ کہنے کو تھی کہ جاوید بستر میں اٹھتے ہوئے غرّایا۔ "ہر وقت شاپنگ، ہر وقت بازار...... قارون کا خزانہ تو ہاتھ نہیں آگیا جو یوں لٹاتی پھر رہی ہو۔"

وہ ہکا بکّا اس کا منہ تکتی رہ گئی۔

"پیسہ آرہا ہے تو اسے سنبھال کر بھی رکھو۔ کیا خبر......" وہ کچھ کہتے کہتے رک گیا۔

فاخرہ حیران سی پلنگ کی پائینتی کی طرف بیٹھ گئی۔ جاوید نے سر دونوں ہاتھوں پر گرا لیا تھا۔

"آپ کو کیا ہو گیا ہے......" فاخرہ نے چند لمحوں بعد بڑے دکھ سے پوچھا۔

"تمہارا سر......" وہ غرّایا۔

"جاوید"...... وہ آنسو ضبط نہ کر سکی۔

"مجھے شاید...... یہ نوکری...... چھوڑنا پڑے......" وہ کچھ مرعوب سا ہوا۔

"کیوں...... آخر مجھے بتاتے کیوں نہیں ہیں......؟" فاخرہ آنسو پونچھے بغیر بولی۔

جاوید پھر بھڑک اٹھا۔ بولا "ہر بات تمہیں بتانا ضروری ہوتی ہے...... مت پوچھا کرو۔"

وہ رونے لگی۔ جاوید اُٹھ کر باہر چلا گیا۔

آج وہ زیادہ ہی پریشان تھا۔ نور احمد نے اسے اپنے آفس میں بلایا تھا۔ بغیر کسی تمہید کے بولے تھے۔ "تم شادی شدہ ہو؟"

"جی" اس نے جواب دیا تھا۔

"نورینہ کو نہ بھی بتاتے تو کچھ بُری بات نہ تھی۔ وہ صدمے سے نڈھال ہے۔"

وہ چپ رہا۔

نور احمد نے سرد مہری سے کہا۔ "تم جا سکتے ہو۔"

راہ جاتے مصیبت گلے پڑنے والی بات تھی۔ جاوید کا ذہن سوچتے سوچتے ماؤف سا ہونے لگا۔ نور احمد کی مہربانیاں اور التفات خاص مقصد کے تحت ہی تھے۔ آج انہوں نے جس انداز میں بات کی تھی، جاوید کے لیے خطرے کا الارم تھی۔ اسی لیے وہ الجھا ہوا تھا اور مزاج میں چڑچڑاپن شامل ہو گیا تھا۔

اگر نور احمد صاحب نے نوکری سے برطرف کر دیا تو...... تو...... اس سے آگے اس کی سوچ کی رسائی نہ تھی اور اب جو فاخرہ ڈھیر ساری شاپنگ کر آئی تھی، اسے غصہ ہی آنا تھا۔

نور احمد صاحب کو جاوید پر غصہ تھا۔ گو بے معنی تھا لیکن بیٹی کا دکھ دیکھ نہ پائے تھے۔ وہ بمشکل تو سنبھل پائی تھی اور جاوید میں جتنی دلچسپی لے رہی تھی، اس سے انہیں خوشی تھی کہ چلو اس نے اسلم کا متبادل پا لیا۔

لیکن جاوید شادی شدہ تھا۔ ایک بچی بھی تھی...... اور پُرسکون سا گھر بھی تھا۔

جو کچھ بھی تھا، انہیں صرف اور صرف نورینہ کا مفاد عزیز تھا اور اس کی خوشیاں خریدنے کے لیے وہ آخری حدوں تک بھی جا سکتے تھے۔ یہی حال نورینہ کی ممی کا بھی تھا۔

جاوید کے شادی شدہ ہونے سے انہیں دھچکا تو لگا تھا۔

لیکن

پھر

انہوں نے سوچا تھا...... کہ وہ مرد ہے اور دوسری شادی بھی گناہ نہیں۔ ترغیب دلانے کی ضرورت تھی۔

انہوں نے یہی بات بڑی رازداری سے نور احمد سے کہی تھی۔ اسی لیے آج نور احمد نے جاوید کو گھر بلایا تھا۔ اس کی ممی نورینہ کو لے کر ڈاکٹر آفندی کے پاس گئی تھیں...... انہوں نے شام باہر ہی گزارنے کا پروگرام بنایا تھا تاکہ نور احمد جاوید سے پوری بے تکلفی سے بات کر سکیں۔

جاوید ان کے ہاں جانے سے ہچکچا رہا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ کوئی اَن ہونی ہونے کی کوشش کرے گی۔

نور احمد نے جیسے اسے اغوا کر کے گاڑی میں ڈالا۔ وہ کہتا ہی رہ گیا کہ کل شب برات ہے اور اس نے بیوی اور بچوں کے لیے چیزیں خریدنا ہیں۔

"جیب میں پیسے ہوں تو شاپنگ بھی ہوتی ہے۔ میاں تم چلو تو سہی۔" وہ بے تکلفی سے اس کا ہاتھ پکڑ کر گاڑی میں بٹھاتے ہوئے بولے۔

جاوید کو ان کے ساتھ جانا پڑا۔

لیکن

آج اس نے بھی دل میں عہد کر لیا کہ دو ٹوک جواب دے کر ہی جائے گا، خواہ اس کی قیمت اسے اپنی معقول اور لگی لگائی آمدنی سے دستبردار ہونے کی صورت میں دینا پڑے۔

ڈرائنگ روم میں داخل ہوتے ہی جاوید کو بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے انہوں نے ملازم کو چائے لانے کے لیے آواز دی۔

جاوید صوفے پر سر جھکا کر خاموش بیٹھ گیا۔ نور احمد نے پائپ سلگایا اور اس کے قریب آ بیٹھے۔

ادھر ادھر کی پھیکی پھیکی باتیں کرنے کے بعد نور احمد سنجیدہ ہو گئے اور بولے۔ "تمہیں یہاں لانے کا مقصد......"

وہ بات کاٹ کر جلدی سے بولا۔ "میں جانتا ہوں لیکن معاف کیجئے گا، میں آپ کے کسی کام نہ آسکوں گا۔"

"سنو تو...... بہت جذباتی ہو رہے ہو۔"

"اس لئے کہ میری ایک معصوم بچی ہے اور ایک وفاشعار بیوی کا خاوند ہوں......"

"ان کے مفاد ہی کی بات کرنے لگا ہوں۔"

"اگر آپ میرے جذبوں کو مالی ترازو میں تولنے کی کوشش کرنا چاہتے ہیں تو یہ فضول ہو گی۔"

"جاوید میاں......"

"مجھے اجازت دیں۔"

"بات سن بھی نہیں سکتے۔ صرف اک تجویز ہی ہے۔ تم میرے جذبات بھی نہیں سمجھ سکتے۔ میں اک ازلی دکھیا بچی کا باپ ہوں۔ میری بچی نے جب بھی خوشیاں چھننا چاہیں، اس کے ہاتھ کانٹوں سے لہولہان ہو گئے......"

وہ بڑے دردیلے لہجے میں بول رہے تھے۔ جاوید بے قرار سا ہوا۔ اس نے کچھ کہنا بھی چاہا تو انہوں نے موقع نہ دیا۔ موثر اور لمبی چوڑی تقریر کرنے کے بعد آہستگی سے بولے۔ "میں تمہیں مالا مال کر سکتا ہوں۔ کہو تو بزنس پارٹنر بنا لوں گا۔ تمہاری آمدنی اتنی ہو جائے گی کہ تم اپنی بیوی بچی کو بھی سپورٹ کر سکو گے اور......"

"سر میں معافی چاہتا ہوں۔ میں ایسا کوئی محل تعمیر نہیں کروں گا جس کی بنیادیں میری بیوی اور بچی کی زندہ نعشوں پر اٹھیں۔"

نور احمد نے ایک پھیکا سا بلند قہقہہ لگایا...... "پاگل ہو بالکل۔ اس پیشکش کو ٹھکراؤ نہیں۔ میں تمہیں مہلت دیتا ہوں، سوچ لو۔ شب برات کی کل تو چھٹی ہے، پرسوں جواب دے دینا......"

وہ سرخ چہرے اور انگارہ سی آنکھوں سے نور احمد کو تکتے ہوئے بولا......

"ٹھیک ہے، میں پرسوں جواب دے دوں گا۔"

وہ اک جھٹکے سے اٹھ کھڑا ہوا......

"بیٹھو بھئی...... چائے آ رہی ہے۔"

"جی بس، شکریہ۔ مجھے ابھی بازار بھی جانا ہے اور دفتر سے سائیکل لینی ہے......"

"ڈرائیور دفتر تک چھوڑ آئے گا۔"

"شکریہ، میں چلا جاؤں گا۔"

وہ ہاتھ ملائے بغیر جانے لگا۔ نور احمد کو اپنی اس سبکی پر غصہ بھی آیا لیکن ضبط کر کے بولے۔ "میں پرسوں تمہارے جواب کا انتظار کروں گا......"

وہ جواب دیئے بغیر دروازہ کی طرف بڑھا۔

نور احمد کی آواز اسے سنائی دی...... "حماقت تمہیں بہت نقصان پہنچا سکتی ہے، سوچ لینا......"

اس نے پلٹ کر بھی نہیں دیکھا۔ تیز تیز قدموں سے چلتا باہر نکل گیا۔

کل شب برات نہ ہوتی تو وہ بازار بالکل نہیں جانا چاہتا تھا لیکن بے بی نے فرمائش کی تھی۔ "ابو نیا فراک پہنوں گی...... ضرور لایئے گا......"

اس نے اپنی سہیلی کا نائیلون کی جھالروں اور فیتوں والا فراک ابو کو دکھایا تھا۔

فراک کے ساتھ پٹاخوں کی بھی فرمائش کی تھی۔ پھلجھڑیاں، انار اور گولے بچے کئی دنوں سے چلا رہے تھے۔

وہ فاخرہ کے لیے بھی کوئی تحفہ لے جانا چاہتا تھا۔ بہت دنوں سے وہ اس سے روٹھی روٹھی تھی۔ وہ بھی تو بلاوجہ اسے ڈانٹتا رہتا تھا۔ اپنی پرابلم اسے کبھی نہ بتائی تھی...... غصے اور الجھاؤ سے ہمیشہ اس پر برستا رہتا تھا۔

وہ بازار گیا، چیزیں خریدیں۔ فاخرہ کے لیے نیل پالش اور لپ اسٹک بھی لی اور ایک چھوٹی سی پرفیوم کی شیشی بھی لے لی۔

گو وہ بہت اپ سیٹ تھا لیکن یہ چیزیں خرید کر اسے اطمینان ہوا تھا۔ ویسے بھی تذبذب اور کشمکش سے نکل گیا تھا۔ اس لیے پوری توجہ بیٹی اور بیوی کی طرف مبذول کر دی۔

پرسوں اس نے نور احمد کو استعفیٰ پیش کرنے کا مصمم ارادہ کر لیا تھا۔

"نہ رہے بانس نہ بجے بانسری۔" اس نے سوچ کر اطمینان کر لیا تھا، باقی رہی نوکری تو وہ کہیں نہ کہیں ڈھونڈ ہی لے گا۔ زیادہ نہ سہی، کم تنخواہ پر ہی کام کر لے گا اور وہ اس دوران پیش آنے والی ہر مالی مشکل سے ذہنی ہم آہنگی پیدا کرنے کی کوشش کرے گا۔

لیکن

وہ

پرسوں

آ ہی نہ سکی۔

شب برات کو بے بی نے نیلا خوبصورت نائیلون کی لیسوں اور فیتوں والا فراک پہنا...... تو جاوید نے اسے بازوؤں میں بھر لیا۔ "میری ننھی سی گڑیا۔ بادلوں کی شہزادی لگ رہی ہے......"

"ماشاءاللہ......" فاخرہ نے بیٹی کی نگاہوں ہی نگاہوں میں بلائیں لیں۔

جاوید بچی کو والہانہ انداز میں پیار کرنے لگا...... "ابو چھوڑیں نا۔" بے بی تنگ آکر اس کے بازوؤں سے نکلی۔ پھر ماں کی طرف دیکھا اور معصومیت سے بولی۔ "امی اپنی سہیلیوں کو فراک دکھاؤں؟"

"ضرور دکھاؤ۔" فاخرہ نے بڑی شان سے کہا۔ محلے بھر میں ایسا فراک کسی بچی کے پاس نہیں تھا۔

اُچھلتی کُودتی بے بی گھر سے باہر نکل گئی۔

جاوید اٹھ کر اندر آگیا۔ فاخرہ شام کا کھانا بنانے لگی۔ آج کھانے میں بھی بہت اہتمام تھا۔ صبح سے وہ کھانا بنانے میں لگی ہوئی تھی۔ ختم بھی دلانا تھا۔ پوریاں تو بازار سے منگوالی تھیں۔ حلوہ گھر پہ ہی بنا رہی تھی۔

چہکتی مہکتی شام بڑی خوبصورت تھی۔ فاخرہ نے بھی نئے کپڑے پہنے تھے۔

بہت دنوں بعد جاوید اسے خوبصورت لباس میں دیکھ کر مستانی ادا سے مسکرایا تھا۔

فاخرہ گِلے کے انداز میں مسکراتے ہوئے بولی۔ "شکر ہے ہوش میں آگئے جناب......"

"ہاں فاخرہ...... میں نے اپنے ذہن سے سارے بوجھ جھٹک ڈالے ہیں...... جو مالک کو منظور ہو گا، وہی ہو گا......"

فاخرہ نے کچھ پوچھنا چاہا لیکن ڈر گئی۔ کہیں اچھا بھلا خوشگوار موڈ پھر نہ بگڑ جائے اور برس کے برس...... اس تہوار کے موقع پر کوئی بدمزگی آنگن میں اتر آئے۔

کھانا کھانے کے بعد فاخرہ اور بے بی پٹاخے اور موم بتیاں لے کر صحن میں آگئیں۔ جاوید سے ارشد اور ہمایوں ملنے آگئے تھے۔ وہ ان کے ساتھ گلی کی نکڑ پر کھڑا باتیں کر رہا تھا۔ چائے کی دعوت بھی دی تھی لیکن دونوں عجلت میں تھے۔ کھڑے کھڑے ملنے آئے تھے۔

بے بی نے لگن میں پٹاخے ڈال دیئے۔ انار، پھلجھڑیاں، ہوائیاں، گولے بہت سی چیزیں تھیں۔ موم بتیوں کے تین پیکٹ بھی تھے۔

"پہلے موم بتیاں لگالیں دیوار پر۔" فاخرہ نے کہا۔

"ہاں امی...... پھر میری سہیلیاں بھی آئیں گی تو انار چھوڑیں گے۔ میں پٹاخے جینا اور مِنی کو بھی دوں گی...... امی ان کے پاس پیسے نہیں ہیں نا......"

"دے دینا۔"

فاخرہ موم بتیوں کے پیکٹ کھولنے لگی۔

اندھیرا اتر آیا تھا۔ خنکی کافی تھی لیکن فاخرہ اور بے بی صحن میں بغیر جرسی اور شال کے پھر رہی تھیں۔ نئے کپڑوں پر پرانی جرسیاں پہن کر ان کی نمائش کو داغدار تو نہیں کرنا تھا۔

فاخرہ چارپائی اٹھا کر لے آئی اور اسے بیرونی دیوار کے ساتھ کھڑا کر کے اس پر چڑھ گئی۔

"بے بی! موم بتیاں اور ماچس پکڑاؤ۔" اس نے کہا۔ گلی میں اس وقت کوئی

نہیں تھا۔ وہ اطمینان سے موم بتیاں بیرونی دیوار پر لگانا چاہتی تھی۔

فاخرہ نے کچھ کچھ فاصلے پر موم بتیاں لگانا شروع کیں۔ لوگوں نے ہوائیاں اور پٹاخے چھوڑنے شروع کر دیئے تھے۔ شوں شاں اور ٹھوٹھاہ کی آوازیں زور پکڑنے لگیں تھیں۔

"امی بس کریں موم بتیاں۔ پٹاخے چلائیں نا۔" بے بی شوق سے بولی۔

"نہیں بے بی، ابھی نہیں۔ ابو کو آنے دو۔" فاخرہ نے گھوم کر اسے دیکھا۔ چارپائی کھسکنے لگی تھی۔ اس نے جلدی سے دیوار کو پکڑ کر پاؤں مضبوطی سے جمائے۔

"امی! ایک پٹاخہ لے لوں؟" بے بی کا شوق بڑھ رہا تھا۔

"ابھی نہیں۔" فاخرہ نے ڈانٹا۔

بے بی پٹاخوں کو الٹ پلٹ کرنے لگی اور فاخرہ تھوڑے تھوڑے فاصلے پر موم بتیاں لگانے لگی۔ اس نے ایک ہاتھ میں جلتی موم بتی پکڑ رکھی تھی۔ دوسرے میں اَن جلی...... جلتی موم بتی سے وہ پگھلا ہوا موم دیوار پر گراتی اور اَن جلی موم بتی اس پر کھڑی کر دیتی۔ موم ٹھنڈا ہوتا اور موم بتی جگہ پر جم جاتی۔

اس نے دیوار پر موم بتیاں لگالیں۔ پھر چارپائی دوسری دیوار کے ساتھ کھڑی تھی۔ مِنی کے گھر اور ان کے گھر کی دیوار سانجھی تھی۔ فاخرہ نے دیوار پر سے سر نکال کر ان کے صحن میں جھانکا۔

"مِنی" اس نے پکارا۔

"جی خالہ۔" مِنی صحن میں ہی تھی۔

"ابو تو نہیں ہیں گھر پہ؟" وہ بولی۔

"اندر ہیں۔"

"میں موم بتیاں لگانے لگی ہوں دیوار پر۔"

"لگالو...... لگالو......" مِنی کی امی آگئیں۔ "مِنی کے ابا گھر پر ہی ہیں۔ وہ اندر کمرے میں ہیں...... تم لگالو...... باہر نہیں آئیں گے۔"

مِنی کی امی اور فاخرہ باتیں کرنے لگیں۔

ادھر ادھر کی باتوں کے بعد فاخرہ نے کہا۔ "مِنی کو بھیج دو ہمارے یہاں۔ بے بی کے ساتھ یہ بھی پٹاخے چھوڑے گی۔ بہت سارے پٹاخے لے آئے تھے بے بی کے ابو...... آجاؤ منی...... آجاؤ۔"

منی نے ماں کی طرف دیکھا۔

"چلی جاؤ۔" اس نے اجازت دے دی۔ "پٹاخوں کو چھیڑنا نہیں، خالہ چلائیں گی تو دیکھ لینا۔"

"اچھا اماں" منی سرپاؤں سے ننگی بھاگی آئی۔

فاخرہ تھوڑے تھوڑے فاصلے پر موم بتیاں لگانے لگی۔ ساتھ ساتھ منی کی ماں سے باتیں بھی کرتی جارہی تھی۔

ابھی

آدھی دیوار پر بھی نہ لگاپائی تھی

کہ

قیامت ٹوٹ پڑی۔ سارے پٹاخے، انار ایک دم چھوٹ پڑے تھے۔ گولوں کے دھماکے بموں کی طرح ہو رہے تھے

اور

اور

بے بی ان جلتے اناروں، پٹاخوں، پھلجھڑیوں کے درمیان آگ کی لپیٹ میں آگئی تھی۔

"ہائے ہائے...... "منی ڈیوڑھی کے دروازے ہی سے چیخی......

بے بی بے تحاشہ دوڑتے ہوئے نائیلون کے فراک میں لگی آگ کو بُجھا رہی تھی۔

فاخرہ نے "ہائے میں مر گئی۔" کہہ کر چھلانگ لگائی اور تڑپ کر بے بی کی طرف بڑھی۔

صحن میں آگ ہی آگ تھی۔

بے بی اور فاخرہ کی چیخیں تڑپ رہی تھیں۔ منی تھر تھر کانپتے ہوئے دروازے ہی میں کھڑی چیخیں مار رہی تھی۔

منی کی ماں بھاگی آئی۔

اس کے پیچھے محلے کے بہت سے لوگ بھی گھس آئے۔ عورتیں، مرد، بچے، بوڑھے سبھی دوڑے آئے۔

فاخرہ سینہ پیٹ رہی تھی اور بے بی...... نائیلون کا فراک جل کر بدن سے چپک گیا ہوا تھا۔ چیخیں مارتے مارتے وہ بے ہوش ہو گئی تھی۔

لوگوں کو جمع ہونے اور جاوید کو خبر ہونے تک بے بی کا آدھا چہرہ جھلس چکا تھا اور جسم کا دایاں حصہ جلے ہوئے فراک سے چپک کر جل چکا تھا۔

اک قیامت تھی۔

جاوید پاگلوں کی طرح جھلسی ہوئی بچی سے لپٹ رہا تھا۔ فاخرہ بے ہوش ہو گئی تھی۔

اور

لوگ جاوید کے ہاتھوں سے بچی کو چھین کر جلدی جلدی ہسپتال لے جانے کے لیے شور مچا رہے تھے۔

"میں نے اسے راہِ راست پر لانے کے لیے ہر ممکن کوشش کی۔ اپنا بزنس پارٹنر بنانے کا بھی کہا لیکن عجیب سر پھرا آدمی ہے، اس پر کسی بات کا اثر ہی نہ ہوا...... اُٹھ کر چلا گیا۔" نور احمد نے اپنی ہتک کا دکھ پیتے ہوئے بیوی سے کہا۔

"ہوں۔" وہ متفکر تھیں۔

"ڈاکٹر نے کیا کہا؟"

"کچھ خاص بات نہیں...... نورینہ کو کافی دیر سمجھاتا رہا۔"

"پھر......؟"

"وہ خاموشی سے سنتی رہی۔"

"تم نے ساری بات بتادی تھی؟"

"ہاں...... نورینہ نے خود ہی بتایا تھا کہ جاوید شادی شدہ ہے اور ایک بچی کا باپ ہے۔"

"خود نورینہ نے بتایا؟"

"ہاں......"

"تم نے نورینہ سے کوئی بات کی؟"

"نہیں۔ وہ اداس ضرور ہے لیکن معاملے کی سنجیدگی سے ناواقف بھی نہیں......"

"ہوں۔"

"وہ کہہ رہی ہے کہ کچھ دیر کے لیے باہر جانا چاہتی ہے۔"

"کہاں؟"

"شگاگو...... آنٹی کے پاس۔"

"تمہارا کیا خیال ہے؟"

"چلی جائے تو اچھا ہی ہے۔ کچھ بہل ہی جائے گی۔ صوفیہ کی بیٹیاں اس کی ہم عمر ہیں۔"

"ٹھیک ہے۔"

"جاوید سے تو کسی امید کو وابستہ کرنا حماقت ہی ہے۔"

"میں تو نورینہ کی خاطر اس سے بات کرنے پر آمادہ ہوا تھا ورنہ یہ نچلے متوسط طبقے کا آدمی ہے۔ ہمارا اس سے میل ہی کیا؟"

"وہ تو ٹھیک ہے لیکن ضرورت اور مجبوری......"

"نورینہ کا وہم ہی ہے ورنہ اسلم کہاں اور یہ لڑکا کہاں......"

"یہ تو نہ کہیں مشابہت تو اتنی زیادہ ہے کہ نظر انداز نہیں کی جاسکتی۔"

"صرف جسمانی مشابہت ہی دیکھنا ہے۔ اسلم اور جاوید کے ذہنوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے...... کہاں وہ تھا کہ کوئی موقع ہاتھ سے کھونا جانتا ہی نہ تھا۔ کہاں یہ صاحب کہ بزنس پارٹنر بنانے کی پیشکش بھی کی تو مسترد کر دی۔"

"اس لیے ڈیڈی......" اچانک نورینہ کمرے سے نکل کر لابی میں آگئی۔

ممی اور ڈیڈی نے چونک کر اسے دیکھا۔ ڈیڈی گھبرائے کہ ان کی ساری باتیں اس نے سن لی تھیں۔

نورینہ نے ان کے قریب صوفے پر بیٹھتے ہوئے صوفے کی پشت پر گردن ڈال کہ آنکھیں بند کرتے ہوئے بات پوری کی۔ "جاوید بک نہیں سکا۔ اس سے اس کی شخصیت سامنے آتی ہے ڈیڈی۔ وہ بہت اونچا، بڑا عظیم انسان ہے۔"

نور احمد نے گردن موڑ کر بیٹی کو دیکھا۔ کتنا دکھ اور کرب تھا اس کے چہرے پر...... دل میں ہوک سی اٹھی۔ ایک ہی بچی تھی۔ روگ ہی روگ پالے تھے۔ اس اکلوتی نازک سی بچی نے۔

ممی نے نور احمد کو آنکھ سے اشارہ کیا۔ وہ ان کی بات سمجھتے ہوئے نورینہ کے سر پر ہاتھ پھیرنے لگی۔ پھر اس کا سر بڑے پیار سے اپنی چھاتی سے لگالیا۔

"نورینہ...... تم باہر جانا چاہ رہی ہو؟"

"جی ڈیڈی......" اس نے ان سے الگ ہوتے ہوئے کہا۔ "چند ماہ کے لیے آنٹی کے پاس چلی جاؤں تو......"

"تمہاری خوشی...... میں جلد ہی بندوبست کروں گا۔ شاید وہاں جاکر تمہاری طبیعت بہل جائے۔"

"طبیعت کی بات چھوڑیں ڈیڈی۔" اس نے اک آہ بھر کر مسکرانے کی کوشش کی۔ ممی اور ڈیڈی دونوں ہی افسردہ ہوگئے۔

وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

"کہاں؟"

"اپنے کمرے میں۔"

"یہیں بیٹھو، کچھ باتیں کرو۔ کمرے میں اکیلی بیٹھی رہتی ہو اور کچھ نہیں تو شگاگو کا پروگرام ہی بناؤ۔"

ڈیڈی کی بات پر وہ ہنس دی۔ چند لمحے مسکراتی رہی۔ پھر باری باری ماں اور باپ کو دیکھ کر بولی۔ "آپ شاید مجھے ذہنی بیمار سمجھتے ہیں۔ آپ کو خدشہ ہے کہ کہیں میرا نروس بریک ڈاؤن نہ ہو جائے۔"

دونوں کھسیانے سے ہوگئے۔

وہ بڑے بڑے شیشوں کی دیوار سے باہر دیکھتے ہوئے بولی۔ "فکر نہ کیا کریں...... ایسا نہیں ہوگا...... میں نے دکھوں سے سمجھوتہ کر لیا ہے۔"

ممی کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔ ڈیڈی نے اک نگاہ درد اس پر ڈالی۔ اس لمحہ وہ اپنے آپ کو کتنے بے بس اور مجبور لگے۔ کروڑوں کے مالک تھے، دنیا جہاں کی آسائش حاصل کر سکتے تھے۔

لیکن

لیکن

اپنی بیٹی کے سُکھ خریدنے پر قادر نہیں تھے اس کے چہرے پر خوشیوں کے پھول کھلانے سے قاصر تھے۔ مسرتوں کے لمحے پکڑ کر اس کی جھولی میں نہ بھر سکتے تھے۔

"ڈیڈی......" وہ بولی جو سر تا پا یاس و محرومی کی تصویر تھی......

"جی......"

"ڈیڈی آپ آئندہ جاوید سے کچھ نہ کہیئے گا۔ وہ اپنی بیوی اور بچی سے ٹوٹ کر محبت کرتا ہے۔ وہ بہت اونچا انسان ہے۔ اس نے آپ کی پیشکش کو ٹھکرا کر اپنے مضبوط کردار کا مظاہرہ کیا ہے۔ میں...... میں اس بات کی تعریف کروں گی...... کاش...... کاش......" اس کی آواز بھرا گئی۔

اور

وہ تیز تیز قدم اُٹھا کر اپنے کمرے میں چلی گئی۔

ممی اور ڈیڈی نے ٹھنڈی آہ بھر کر ایک دوسرے کو دیکھا۔ ان کے بس میں کچھ نہیں تھا۔ نورینہ کا کاش...... کاش کہنا اس کے دلی دکھ اور درد کا کھلا اظہار تھا۔ پھر وہ رو دینے کو بھی تھی...... ماں باپ کا کلیجہ کٹنے لگا۔

"اسے بہت جلد باہر بھجوا دیں۔" ممی نے آنکھیں رومال کے کونے سے صاف کرتے ہوئے کہا۔

"ہوں۔ میں بھی یہی سوچ رہا ہوں۔ انہی حالات میں گھری رہی تو پھر اسی طرح ہو جائے گی۔"

"ایک ہی واردات بار بار ٹوٹ رہی ہے اس پر۔"

"ہم بے بس ہیں۔"

"کاش جاوید مان جاتا...... ہم بھی اپنی بچی کے چہرے پر خوشیوں کے پر تو دیکھتے۔"

"میں نے بہت کچھ کہا...... میرا خیال تھا...... وہ غریب ہے۔ اتنی بڑی آفر کو

نہیں ٹھکرائے گا...... لیکن......"

"ویسے کہا اس نے ٹھیک ہی ہے۔ ہم صرف اپنی بچی کی جھولی خوشیوں سے بھرنا چاہتے ہیں...... یہ کب سوچتے ہیں کہ ایسا کرنے سے اس کی بچی خوشیوں سے محروم ہو جائے گی۔ ایک عورت اپنے سہاگ......"

"ہم نے کون سا بیوی بچی کو چھوڑ دینے کا کہا تھا۔ لوگ دو دو چھوڑ تین تین چار چار بیویوں سے بھی تو نباہ کرتے ہیں۔"

"ظلم ہی ہوتا ہے۔"

ممی اور ڈیڈی اس موضوع پر باتیں کرتے ہوئے اپنی اپنی ذات کے حصار سے نکل آئے تھے۔ جاوید کا عمل ان کے لئے بھی اک مثال تھا...... اور اسے کریڈٹ دینا ہی پڑ رہا تھا...... جیسے نورینہ نے دیا تھا......

جاوید کی حالت پاگلوں کی سی تھی۔ بچی کا گوشت اور چربی پگھل پگھل کر نائیلون کے فراک میں چمٹ گیا تھا۔ بازو کی تو ہڈی بھی نظر آتی تھی...... گلی محلے کے لوگوں نے آکر بچی پر کمبل ڈالا تھا۔ آگ بجھائی تھی۔ جلتے پٹاخوں کو بمشکل بجھایا تھا اور یہی لوگ بے بی کو تانگے میں ڈال کر ہسپتال لے گئے تھے۔ شب برات کی چھٹی تھی۔ بڑی مشکل سے ایمر جنسی وارڈ میں بے بی کو پہنچایا گیا۔ یوں بھی غریب لوگ تھے۔ بڑے ڈاکٹروں تک رسائی نہ تھی اور کیس بھی اتنا سیریس تھا۔ ایڈمشن ضروری تھی۔ محلے کا ایک پڑھا لکھا نوجوان پیش پیش تھا۔ اسی نے ہمت اور جرأت کا مظاہرہ کیا تو بے بی کو ایڈمٹ کر لیا گیا۔

بے بی اس بُری طرح جھلسی تھی کہ جان کے لالے پڑ گئے تھے۔ نائیلون جل کر گوشت اور چربی میں دھنس گئی تھی۔ دایاں حصہ تو بالکل ہی جل گیا تھا...... چہرہ بھی جھلس گیا تھا اور خوبصورت گھنگھریالے بال بھی جل گئے تھے۔

کہتے ہیں مصیبت آئے تو اکیلی نہیں آتی۔ اس کے جلو میں بہت سی افتادیں بھی ہوتی ہیں۔ جاوید کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا۔ بے بی چار گھنٹے آپریشن تھیٹر میں رہنے کے بعد پٹیوں سے جکڑی وارڈ میں لائی گئی کہ فاخرہ کو آپریشن تھیٹر میں پہنچانا ضروری ہو گیا۔

رات اس نے بے بی کو جلتے دیکھا تو بدحواسی اور گھبراہٹ میں چارپائی سے صحن میں کُود کر اتری...... اچانک صدمہ آن پڑا۔ بلیڈنگ تو رات ہی شروع ہو گئی تھی۔ صبح ہوتے تلک وہ موت کی دہلیز تک جا پہنچی۔

محلے داروں ہی نے جاوید کی بہنوں بھائیوں کو اطلاع دی۔ سب آ پہنچے۔ فاخرہ کو بھی ہسپتال داخل کروا دیا گیا جہاں اس کا ڈی این سی ہوا۔ فاخرہ کا بڑا خطرناک آپریشن تھا۔ دو دن تو وہ بھی موت و حیات کی کشمکش میں مبتلا رہی۔ سات آٹھ ماہ بعد آنے والا صاحبزادہ جو جاوید کی خوشیوں اور فاخرہ کی امیدوں کا مرکز بننے والا تھا، معرض وجود میں آنے سے پہلے ہی چل بسا۔

جاوید کی حالت پاگلوں جیسی نہ ہوتی تو اور کیا ہوتا۔ کبھی بچی کے پاس دوڑتا اور کبھی فاخرہ کو دیکھتا۔ کتنی حسین کیسی پیاری دنیا پل بھر میں اجڑ گئی تھی۔ بنیادوں سے ہل گئی تھی۔

کئی دن تو واقعی وہ جیسے ہوش و حواس سے بیگانہ ہو گیا۔ گھر کی خبر تھی نہ باہر کی...... ہسپتال کے طویل اور ٹھنڈے برآمدے میں ساری ساری رات بے چینی سے ٹہل ٹہل کر گزار دیتا۔ دن بھر اسی طرح گزرتا، وہ تو چند دنوں کے لیے بہنیں اور بھابیاں آگئی تھیں۔ کوئی گھر پہ رہتی، کوئی ہسپتال میں...... بھائی بھی کام سے چھٹی ہونے پر چکر لگا جاتے۔ یہ بھی فاخرہ کا اخلاق تھا جو ان سب سے بنا کر رکھی تھی اور آج اس مصیبت کے موقع پر کام آ رہے تھے۔

افراتفری کے دن گزر گئے۔ جاوید کے ذہن نے افتاد سے کسی حد تک سمجھوتہ کر لیا۔ حقیقت سے فرار نہیں ہو سکتا۔ ہونی ہو چکی تھی۔ اب فاخرہ بھی ٹھیک تھی۔ گو بے تحاشا خون ضائع ہو جانے سے بے حد کمزور ہو گئی تھی...... اور بچی کا زندہ دکھ کلیجے میں تیر کی طرح اترا ہوا تھا۔

پھر بھی

اب پہلے کی نسبت بہتر تھی۔ یوں بھی رشتہ دار کب تک بیٹھے رہتے۔ کون ڈیوٹیاں دیتا...... بے بی تو شاید مہینوں پر پڑ گئی تھی۔ جلے کے زخم اتنی جلدی بھرتے تھوڑا ہی ہیں۔

ہسپتال میں رہنا...... دوائیوں کا خرچہ، سپیشلسٹ کی فیس اور دیگر ضروریات...... جانے اتنے دنوں کس کس نے پیسہ دیا تھا اور کس کس نے خرچ کیا تھا...... جاوید ذرا

سنبھلا تو ان باتوں کا خیال آیا۔ جلدی میں محلے داروں نے یہ نہ سوچا تھا کہ بے بی کو کسی ایسے ہسپتال میں داخل کروائیں جہاں خیراتی وارڈ بھی ہو اور اتنی لمبی بیماری کے علاج کے لیے کچھ نہ کچھ ہسپتال ہی سے مدد مل جائے۔

لیکن

اس وقت کچھ سوچنے کا موقع تھوڑا ہی تھا۔ یہی پرائیویٹ ہسپتال قریب تھا۔ وہیں بے بی کو لے گئے۔ جان کی پڑی تھی۔ پیسے کا اس وقت کون سوچتا۔

فاخرہ کو بھی اسی ہسپتال میں لانا پڑا تھا۔

اور

اب جو اخراجات کا اندازہ لگا تو جاوید کانپ گیا۔ اتنا خرچہ کہاں سے آئے گا...... بات سینکڑوں نہیں ہزاروں میں پہنچ رہی تھی۔

انجکشن اور دوائیاں ہی جو لائی گئی تھیں اور جو ابھی لائی جانی تھیں، جاوید کے حواس گم کر دینے والی تھیں۔

لیکن

اس افتاد سے بھی نپٹنا ہی تھا۔ کچھ پیسے بینک میں تھے۔ وہ نکلوائے، جس جس نے خرچ کیا تھا، اس کا قرضہ چکایا...... رشتہ داروں نے سب سے پہلے اپنی اپنی رقم وصول کی۔

دن گزرنے لگے۔

جاوید...... جس نے استعفیٰ دے کر نئی ملازمت ڈھونڈنے کا عہد کر لیا تھا۔ یوں جکڑا گیا کہ جائے رفتن نہ پائے ماندن...... کئی دن تو آفس جا ہی نہ سکا۔ نہ ہی چھٹی کی درخواست بھیج سکا۔

وہ تو بھلا ہو ارشد کا۔ خود ہی چھٹی کی درخواست ٹائپ کر کے لے آیا اور جاوید کے دستخط کروانے ہسپتال ہی آ گیا۔ اپنے اس پُر خلوص دوست کو بڑی تسلی و تشفی دینے کے بعد بولا۔ "جاوید مجھے اپنا بھائی سمجھو...... پیسے کی ضرورت ہو تو فوراً بتا دینا۔ میرے پاس نقد تو شاید زیادہ نہ ہو۔ میری بیوی کے پاس تھوڑا سا زیور ہے۔ میں بیچ کر تمہیں پیسہ لا دوں گا......"

اس سچے جذبات میں لپٹی پیشکش پر جاوید کی آنکھیں بھر آئیں۔ وہ آہستگی سے بولا۔ "شاید کسی وقت تمہیں بھی تکلیف دینا پڑے۔ فی الحال میں بھی زیور بیچ رہا ہوں...... فاخرہ کے پاس دو تین تولے سونا ہے۔"

زیور بھی بک گیا

اور

فاخرہ کے شوق سے خریدے ہوئے سیکنڈ ہینڈ صوفے اور کرسیوں کی باری بھی آ گئی۔

سارا پیسہ پرائیویٹ ہسپتال کی نظر ہونے لگا۔

بے بی کے چہرے کے زخم کچھ مندمل ہو رہے تھے۔ اب پٹی کھلی تھی۔ فاخرہ تو بچی کا چہرہ دیکھ کر اپنی چیخیں ضبط نہ کر سکی۔ اتنا پیارا اور معصوم پھول سا چہرہ اتنا بھیانک ہو گیا تھا۔

جاوید بھی چیخ اٹھا...... اس نے دیوار سے اپنا سر ٹکرا ٹکرا کر وہ دیوانوں کی طرح آہ و بکا کی...... بے بی جو تازہ کھلے ہوئے پھول کی مانند تھی، اب اتنی بھیانک اور خوفناک نظر آ رہی تھی۔ ابھی تو صرف چہرے کی پٹیاں کھلی تھیں۔ دایاں حصہ تو ابھی تک پٹیوں کی لپیٹ میں تھا۔ بے بی کا جسم نیم دائرے کی صورت اختیار کر گیا تھا۔ دائیں طرف کا گوشت جلنے سے سکڑ کر اکٹھا ہو گیا تھا۔

چہرہ بھیانک ہونا یا جسم کا نیم دائرے کی صورت اختیار کرنا اپنی جگہ اذیت دہ تھا۔ اصلی اذیت تو بے بی کی چیخوں سے ہوتی تھی۔ نیم دائرے ایسا جسم ذرا سی حرکت پر بھی اتنی تکلیف پہنچاتا تھا کہ بیچاری چیخ چیخ کر رونے لگتی تھی۔

"بڑے دنوں بعد نظر آئے ہو۔"

"سر میں چھٹی پر ہوں۔"

"ہاں مجھے چند دن ہوئے اشفاق صاحب نے بتایا تھا۔ شاید تمہاری بچی بیمار ہے......"

ایک سسکی جاوید کے حلق میں اٹک گئی۔

"بیٹھ جاؤ۔" نور احمد نے سرد مہری سے کہا۔

وہ شاندار آفس ٹیبل کے دوسری طرف رکھی کالی ریکسین والی فوم کی کرسی پر بیٹھ گیا۔ نور احمد پائپ کا کش لے کر ریوالونگ چیئر پر ادھر اُدھر ہولے ہولے ہلتے ہوئے جاوید کی طرف دیکھنے لگے۔

جاوید

جو خود بھی برسوں کا بیمار نظر آتا تھا۔ شیو بھی نہیں کی ہوئی تھی اور بغیر شیو کے چہرے پر زردی کھنڈی ہوئی تھی۔ اس کے لب خشک تھے اور آنکھوں میں کھچاؤ سا محسوس ہو رہا تھا۔ اس نے لباس بھی بے ترتیب سا پہن رکھا تھا۔

ارشد سے نور احمد کو بچی کے جلنے اور جاوید کے مالی خستہ حالی کی خبر مل چکی تھی۔ جاوید کا حلیہ بھی اس کی ضرورت مندی کا اعلان کر رہا تھا۔ نور احمد جان گئے تھے کہ وہ مجبور ہو کر ان کے پاس آیا ہے۔

لیکن انہیں اس کی حالت پر رحم نہیں آیا بلکہ غصہ آ گیا۔ دل ہی دل میں اسے کوسنے لگے۔ "نامعقول آدمی۔ اپنی غرض ہے تو بھاگا چلا آیا ہے۔ ہونہہ...... یہ لوگ منہ

لگانے کے قابل ہی نہیں ہوتے۔" یہ ایک خود پسند سرمایہ دار کی سوچ تھی۔

"سر......" جاوید قدرے تامل کے بعد روہانسی آواز میں بولا۔

"یس......" پائپ کا کش لیتے ہوئے وہ تمسخر سے مسکرائے۔

وہ چپ رہا۔

نور احمد خود ہی بولے۔ "تنخواہ لینے آئے ہو؟"

"سر تنخواہ میں لے گیا تھا۔"

"اب کیا چاہتے ہو......؟"

"سر...... میرے مالی حالات بہت خراب ہیں۔ بچی ہوسپٹل میں ہے۔ پیسے کی ضرورت ہے۔"

"کیا چاہتے ہو؟"

"کچھ ایڈوانس......" اس نے جیب سے ایک درخواست نکالی اور اس کے سامنے رکھ دی۔

"اتنا پیسہ......"

"یس سر......"

"کیا کرو گے؟"

"سر ہوسپٹل کے بل جمع کروانے ہیں۔ ڈاکٹروں کی فیس بھی دینا ہے اور......"

"لیکن میں اتنی بڑی رقم ریکمنڈ نہیں کروں گا۔"

"سر......" وہ سسک اٹھا۔ پھر منت و زاری کے انداز میں بولا۔

"میں سخت پریشان ہوں سر۔"

"میں تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکتا......"

"تھوڑا سا قرض ہی دے دیں۔ مجھے بل ادا کرنے ہیں سر پلیز۔"

نور احمد دل کڑا کیے رہے۔

وہ روہانسی، گلوگیر اور آنسو بھری آواز میں التجائیں کرنے لگا۔ ایک بار تو اس نے ہاتھ بھی باندھ دیے۔ "سر آپ کا احسان عمر بھر نہیں بھولوں گا۔"

نور احمد نے حقارت سے قہقہہ لگایا...... پھر بولے۔ "بچی تکلیف میں ہے نا تمہاری......"

"ہاں...... سر...... اس کی تکلیف دیکھی نہیں جا سکتی......"

نور احمد کچھ اداس ہو گئے...... "ہاں ان کی تکلیف دیکھی نہیں جاتی...... ان کی تکلیف دُور کرنے کے لیے باپ ذلیل بھی ہوتے ہیں، خوار بھی......"

جاوید نے پھٹی پھٹی نگاہوں سے انہیں دیکھا۔ وہ بے حد مضطرب تھے۔

مایوس ہو کر وہ اٹھ کھڑا ہوا...... جاوید سمجھ گیا کہ وہ اس سے بدلہ لے رہے ہیں۔

"ٹھہرو......" نور احمد نے کہا۔ جاوید رُک گیا۔

نور احمد چند ثانیے اسے دیکھتے رہے، کچھ سوچا۔

پھر

پن اٹھا کر ریکمنڈ کر دیا۔ پانچ ہزار کی فوری ادائیگی پر دستخط کر دیے۔

جاوید احسان مندی سے جھک گیا۔ اس کی کھنچی کھنچی آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔

اس کے جانے کے بعد نور احمد آفس میں بیٹھ نہ سکے۔ طبیعت بے طرح اداس ہو گئی تھی۔ جاوید پر رحم نہ کھانا چاہتے تھے لیکن اس کی مدد کر دی۔

پھر سیکرٹری کو بلا کر ہدایت کرنے لگے۔ اس کے بعد اٹھے اور آفس سے باہر آ گئے۔

بازاروں میں بے مقصد گھومنے پھرنے کے بعد وہ گھر پہنچے تو ممی دروازے ہی میں مل گئیں۔ آج نورینہ کا خط آیا تھا۔ وہ دروازے میں کھڑی کھڑی پڑھ رہی تھیں۔

"آپ ابھی گئے...... اور آ بھی گئے۔" نورینہ کی ممی نے کہا۔

"میں جانتا تھا میری بیٹی کا خط آیا ہو گا...... کیا لکھتی ہے؟" وہ بولے۔

"آپ کو کیسے پتہ چلا کہ نورینہ کا خط ہے؟"

"اک پیار کرنے والے دل کو الہام ہو جاتا ہے۔"

"اوہو......"

"کیا لکھتی ہے؟"

"میں پڑھ لوں۔ پھر آپ پڑھ لیجئے گا۔"

نور احمد اندر چلے گئے...... لابی کے عقبی شیشے کی دیوار سے بیرونی چمن کی بہار نظر آ رہی تھی۔ خوب پھول کھلے تھے۔ سبزہ نکھرا ہوا تھا اور زردی مائل سنہری دھوپ سرشاری کی کیفیت میں ان پر اتر رہی تھی...... بہار پر بہار آئی ہوئی تھی۔

نور احمد صوفے پر گرنے کے انداز میں بیٹھ گئے۔ نورینہ کی ممی خط لے کر آ گئیں...... ان کے چہرے پر مسرت کے آثار تھے۔

نورینہ کا خط مختصر سا تھا لیکن پُر امید تھا۔ وہ آنٹی اور ان کی بیٹیوں کے ساتھ خوش تھی۔ وہاں کئی لوگوں سے مل چکی تھی اور دو ماہ میں وہاں کے لوگوں کو قریب سے دیکھ کر جو محسوس کیا تھا، مختصراً اس کا حال لکھا تھا۔

نور احمد نے خط پڑھ کر سکون سے سانس لیا۔

"چائے یا کافی؟" نورینہ کی ممی نے پوچھا۔

"کچھ مل جائے۔"

اس نے ملازم کو آواز دی اور چائے بنا کر لانے کو کہا۔

"موسم بہت خوبصورت ہو گیا ہے۔" وہ بولیں۔

"چیزیں ہم ہمیشہ اپنے اندر کے حوالے سے دیکھتے ہیں۔ بیٹی کا خط پا کر خوش ہو تو سارا جہان خوش نظر آ رہا ہے۔"

"یہ بات تو ہے۔"

"لیکن اس جہان میں دکھ بھی بہت ہیں۔"

"ان دکھوں کا ہم خود ایک حصہ ہیں۔"

"شاید ہمارا دکھ دوسروں کے مقابلہ میں کچھ کم ہی ہے۔"

نور احمد جاوید کی حالت دیکھ کر بڑے متاثر ہوئے تھے۔ وہ بیوی کو اس کے متعلق بتانے لگے۔

"اوہو...... بچی کا تو وہ دیوانہ تھا......" وہ سننے کے بعد بولیں۔

"اسی لیے یہ حالت بنا رکھی تھی نا...... پیسہ بھی تو نہیں اس کے پاس......"

"بچی ٹھیک ہو جائے گی؟"

"پتہ نہیں...... اشفاق صاحب تو بتا رہے تھے کہ بچی معذور ہو گئی ہے۔ جسم نیم دائرے کی صورت اختیار کر گیا ہے۔ بیٹھ سکتی ہے نا سیدھی لیٹ سکتی ہے۔"

"اوہو...... ہو......"

"وہ بتا رہے تھے کہ ڈاکٹر کہتے ہیں زخم ٹھیک ہو بھی گئے تو جسم ٹھیک نہیں ہو گا۔ بچی شاید خود چل پھر نہ سکے۔"

"توبہ توبہ...... جاوید تو......"

"بالکل پاگل ہو رہا ہے۔ تم اسے دیکھو تو پہچان نہ سکو۔"

"مجھے اس سے کوئی ہمدردی نہیں ہونی چاہیے لیکن...... یہ سب کچھ سن کر جی چاہتا ہے، بچی کو دیکھنے ضرور جائیں۔"

"چلے جائیں گے کسی دن...... ابھی تو وہ ہوسپٹل ہی میں ہے۔"

دونوں باتیں کرنے لگے۔

"مجھے آج جاوید پر غصہ بھی بہت آیا اور ترس بھی۔"

"کیوں؟"

"وہ کچھ لون لینے آیا تھا۔"

"دے دیا؟"

"ہاں...... صرف اس بچی کی خاطر...... جسے ایک باپ ٹوٹ کر پیار کرتا ہے۔"

نورینہ کی ممی نے ایک گہری سانس لی اور بولی۔ "آپ نے اچھا کیا...... مہینوں ہوسپٹل کے اخراجات اٹھانے کی اس میں ہمت کہاں ہو گی......"

نور احمد خلا میں دیکھتے ہوئے نجانے کیا سوچنے لگے۔ ملازم چائے ٹرالی میں رکھ کر لے آیا۔

نورینہ کی ممی اپنے اور نور احمد کے لیے چائے بنانے لگی۔

"تم بچی کو گھر لے جا سکتے ہو۔ ڈریسنگ کسی کمپوڈر سے بھی کروا سکتے ہو۔"

"لیکن ڈاکٹر صاحب! بے بی تو ذرا سی حرکت پر بھی چیخ اٹھتی ہے۔"

"ہاں اس کے سارے مسلز کھنچ گئے ہیں......"

"ان کا علاج......"

"ہو سکتا ہے۔"

"تو پھر ڈاکٹر صاحب۔ خدا کے لیے میری بچی کا علاج کیجئے۔"

"مسٹر جاوید۔"

"جی......"

"یہ علاج ہمارے ہوسپٹل میں نہیں ہو سکتا۔"

"تو...... تو کہاں ہو سکتا ہے......؟"

"باہر کے ملکوں میں...... جرمنی، لندن اور امریکہ کے کسی ہاسپٹل میں......"

"یا خدا" جاوید نے دونوں ہاتھوں پر سر گرا لیا۔ در و دیوار گھوم گئے۔ آنکھوں میں اندھیرا تیر گیا۔

"میں معذرت خواہ ہوں لیکن حقیقت بیان کر دی ہے۔ میں جانتا ہوں آپ علاج افورڈ نہیں کر سکتے......"

"ڈاکٹر صاحب" جاوید دیوانوں کی طرح چیخا۔

"حوصلے سے کام لو...... مجبوری ہے......" ڈاکٹر نے اک گہری سانس لی اور کہا جاوید اس کے کمرے میں بیٹھا تھا۔ پچھلے ماہ کے بلوں کی ادائیگی کے بعد وہ خالی ہاتھ

یہاں آ بیٹھا تھا۔

ڈاکٹر کی بات نے اس کے ہوش اڑا دیے تھے۔ وہ تو اس ہسپتال میں بھی اب علاج جاری نہ رکھ سکتا تھا۔ پونجی ختم ہو گئی تھی۔ دفتر سے لیا ہوا قرضہ بھی ختم ہو چکا تھا۔ دوستوں اور رشتہ داروں سے چھوٹی موٹی رقمیں لے کر بھی خرچ کر چکا تھا۔ تین ماہ سے ہسپتال میں بچی کو لیے بیٹھا تھا۔ ہسپتال بھی وہ جس میں خرچہ ہی خرچہ تھا۔ کوئی چیز بھی ہسپتال کی طرف سے نہ ملتی تھی حتیٰ کہ ڈاکٹر کی فیس بھی اسے ہی ادا کرنا پڑتی تھی۔ ڈاکٹر روز دیکھنے آتا تھا۔ ہفتے میں دو دن سکن سپیشلسٹ کا وزٹ ہوتا تھا...... مرہم پٹی اور دواؤں کی فہرست الگ تھی......

بے بی تو بے بی فاخرہ کے ہوسپٹل میں ایڈمٹ ہونے اور ڈی این سی کے بعد دو دن رہنے پر جو بل بنا تھا، جاوید تو اس کا بھی متحمل نہ تھا۔

اور

اب

ڈاکٹر نے ہزاروں کا نہیں لاکھوں کا خرچہ سنا دیا تھا۔ امریکہ یا کسی بیرونی ملک بچی کو لے جانے کی بات تو وہ سوچ بھی نہ سکتا تھا......

تو

کیا

بچی اسی طرح تڑپتی رہے گی۔ لمحہ لمحہ کی موت مرے گی۔

لمحہ لمحہ کی موت

اچانک جاوید چیخا۔ "ڈاکٹر...... آپ بے بی کو مار ڈالیں۔ ایک ہی دفعہ مار ڈالیں...... اسے مار ڈالیں۔ ڈاکٹر پلیز مار ڈالیں۔ میں اسے لمحہ لمحہ مرتے نہیں دیکھ سکتا...... میں اس زندہ لاش کا کیا کروں گا ڈاکٹر۔ اسے......"

وہ ہچکیوں سے رونے لگا۔ ڈاکٹر کرسی سے اٹھ کر آیا اور جاوید کی کرسی کی پشت پر کھڑے ہو کر اس کے دونوں کندھوں کو تھپتھپایا۔ تین ماہ میں وہ اس آدمی سے خاصا مانوس ہو چکا تھا۔

لیکن

اس کے دکھ کا اس کے پاس علاج نہیں تھا۔

اس نے جاوید کو کھل کر رونے دیا۔ دل کا درد آنسوؤں کی صورت بہہ رہا تھا۔ ڈاکٹر جانتا تھا کہ اس طرح رونے سے اس کے صدمے کا بار کم ہو جائے گا۔

کئی لمحے گزر گئے۔ رونے کے بعد وہ واقعی قدرے سنبھلا۔ جیب سے رومال نکالا اور آنسو صاف کیے۔ ہچکیاں اب بھی اس کے سینے میں ٹوٹ رہی تھیں۔

فاخرہ کی حالت مُردوں سے بدتر تھی۔ تین ماہ سے دن رات بچی کی خدمت کر رہی تھی۔ دن کا چین اور راتوں کی نیند حرام تھے۔ رو رو کر آنکھیں سرخ انگارہ ہو گئی تھیں۔ پلکیں تک جھڑنے لگی تھیں۔ بے بی کے چہرے کی طرف وہ نظر بھر کر دیکھتی ہی نہیں تھی۔ دائیں طرف بالکل ٹھیک تھی لیکن بایاں گال جل گیا تھا۔ جلد جگہ جگہ سے اکٹھی ہو گئی تھی۔ سرخ اور سپید داغ بڑے نمایاں تھے۔ اس طرف کی آنکھ بھی کھنچی ہوئی تھی اور گردن کا گوشت سکڑ کر اکٹھا ہونے سے گردن اسی کندھے پر جھکی رہتی تھی۔ بازو کی ہڈی ننگی نظر آتی تھی...... ٹانگ بھی سکڑ کر مڑ گئی تھی۔ سینے اور پیٹ کا دایاں حصہ اکٹھا ہو گیا تھا جس سے جسم نیم دائرے کی طرح بن گیا تھا...... ذرا سا بازو ادھر اُدھر ہل جاتا یا ٹانگ اُٹھ جاتی تو بے بی کی چیخیں آسمان کو چھو لیتیں۔

یہ زندہ عذاب تھا جو جاوید اور فاخرہ برداشت کرنے پر مجبور تھے۔ تین ماہ اور بارہ دن کے بعد بے بی کو لے کر وہ گھر آئے تو پھوٹ پھوٹ کر رو دیے...... محلے والوں نے تسلی و تشفی دینا چاہی۔ بھائی بہنوں نے صبر کی تلقین کرنا چاہی۔

لیکن

کوئی بھی دلاسہ نہ دے سکا۔ کوئی بھی صبر کرنے کا نہ کہہ سکا۔

نورینہ تین ماہ گزار کر واپس آئی تو کافی صحت مند اور خوش دکھائی دیتی تھی...... ممی ڈیڈی تو بیٹی کو اس رنگ میں دیکھ کر پھولے نہ سمائے۔ بھائیوں نے بھی لپٹ کر پیار کیا اور اس کی صحت مندی پر خوشی کا اظہار کیا۔

نورینہ کی خوش قسمتی تھی کہ شکاگو میں اس کی ملاقات ایسے لوگوں سے ہوئی جو زندگی کے مزاج سے آشنا اور اس کے رویوں سے مثبت ہم آہنگی رکھتے تھے۔ اس نے ان لوگوں سے بھرپور اثر لیا۔ اسی لیے اس کی سوچوں نے سیدھے رخ پلٹا کھایا اور تفکر نے نیا رنگ اختیار کر لیا۔

اس رات سب کھانے کی میز پر بیٹھے تھے۔ ڈنر کھایا جا چکا تھا۔ سویٹ ڈش کھاتے ہوئے باتوں کا دور بھی چل رہا تھا۔

نورینہ وہاں کے قیام کی باتیں سنا رہی تھی۔ آنٹی اور اس کی بیٹیوں کی دوستی کے قصے بھی سُنا رہی تھی...... اور ان کے لیے یہاں سے جو تحائف وہ لے گئی تھی، ان کے متعلق ان لوگوں کے جو تاثرات تھے، وہ بھی بیان کر رہی تھی۔

نوید کا دل بھی باتیں سن سن کر وہاں جانے کو للچانے لگا اور سعید تو ویسے ہی سیر سپاٹے کا شوقین تھا...... وہ بھی ڈیڈی سے کہنے لگا۔ "چھٹیوں میں آپ بھی پروگرام بنائیں ڈیڈی...... ہمیں بھی دنیا دکھا دیں......"

نور احمد مسکرا کر بولے۔ "دنیا دیکھنے کو ابھی تمہاری عمر پڑی ہے۔ پہلے پڑھ لکھ کر لائق ہو جاؤ...... پھر......"

"ڈیڈی میں تو سیر کے لیے جانا چاہتا ہوں۔"

"وہ بھی دیکھیں گے۔"

"ضرور جاؤ سیر کے لیے۔" نورینہ نے کہا۔ "ان لوگوں کو جا کے قریب سے دیکھو اور ان کی اچھی عادتیں اپناؤ......"

"باجی پر کچھ زیادہ ہی رنگ چڑھ گیا ہے امریکنیوں کا......" نوید ہنسا۔

"رنگ چڑھنے کی بات نہیں۔" وہ بولی۔

"تو اور......"

"تین مہینے کسی قوم کا مزاج پرکھنے اور معاشرے کے آداب دیکھنے کے لیے ناکافی عرصہ ہے۔ وہاں کے معاشرے میں برائیاں بھی ہیں اور ہمارے نقطہ نگاہ سے تو بہت سی خامیاں بھی ہیں لیکن...... میں نے جہاں تک دیکھا ہے، وہ لوگ کام میں ایماندار ہیں۔ وقت کے لمحے لمحے کا انہیں احساس ہے۔ عام لوگ عام زندگی میں کسی قسم کی ہیرا پھیری نہیں کرتے......"

"ہونھ" نوید نے چڑایا۔ "ان کی انگریزی فلمیں ہر روز ٹی وی پر دیکھ رہے ہیں۔ فلم یا ناول کسی معاشرے کا عکاس ہوتا ہے۔"

"ٹھیک ہے، میں کب کہہ رہی ہوں کہ وہ لوگ برائیوں سے پاک ہیں لیکن ان کی کچھ خوبیاں ضرور ہیں نوید...... وہ وقت کا زیاں نہیں کرتے۔ کام، خلوص اور ایمانداری سے کرتے ہیں...... اور اپنے وطن اور حکومت سے مخلص ہیں۔"

"یہ خوبیاں ہیں اور انہیں ہمیں بھی اپنانا چاہیے۔" ڈیڈی نے کہا۔

"ہم اندھی تقلید کرتے ہیں۔" ممی بولیں۔ "ان کی جو برائی ہے، وہ اپناتے ہیں اور ان کی یہ خوبی ہے، اس کی طرف آتے ہی نہیں۔"

"یہی دیکھیں نا ممی...... یہاں سب لوگ کام میں ایماندار ہو جائیں اور وقت کا زیاں نہ کریں تو ہماری قوم بھی کہاں سے کہاں پہنچ سکتی ہے۔"

اسی حوالے سے تھوڑی دیر باتیں ہوتی رہیں۔

پھر نورینہ وہاں کے اور قصے سنانے لگی۔

"مجھے تو مسز تھامس نے بہت متاثر کیا...... وہ آنٹی کی ملنے والی ہیں۔ مسٹر اور

مسز تھامس بہت خلیق اور ملنسار ہیں۔"

"متاثر کیسے کیا؟" نوید بولا۔

"دیکھو نوید...... میں نے کہا نا کہ ان لوگوں میں اگر برائیاں ہیں تو کچھ خوبیاں بھی ہیں...... مسٹر اور مسز تھامس کے تین بچے ہیں......"

"پھر......"

"تینوں ان کے پاس ہیں، تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔"

"پھر......؟"

"تم سن کر حیران ہو گے کہ تیسرا بچہ اندھا ہے۔"

"افسوس کی بات ضرور ہے لیکن حیرانگی کی نہیں......"

"حیرانگی کی اس لیے کہ یہ اندھا بچہ ان کا اپنا نہیں......"

نوید نے چونک کر اسے دیکھا۔ ممی اور ڈیڈی بھی حیران ہوئے۔

نورینہ تفصیلات بتانے لگی۔ "ان کے دو بچے تھے لیکن مالی لحاظ سے وہ اس قابل تھے کہ تین بچوں کا بوجھ اٹھا سکیں۔ انہوں نے سوچا، تیسرا بچہ ایڈوپٹ کیوں نہ کر لیں۔ بجائے اس کے کہ وہ تیسرا بچہ اپنا ہوتا۔ انہوں نے یتیم خانہ سے تیسرا بچہ لے لیا۔ یہ بچہ اندھا تھا۔ مسٹر اور مسز تھامس نے اس معذور بچے کو گود لیا اور اس کی تعلیم و تربیت اپنے بچوں کی طرح کر رہے ہیں۔ کتنی بڑی بات ہے۔"

"واقعی۔" ممی اور ڈیڈی بولے۔

"وہ کہتے ہیں۔ اس طرح قوم کا ایک معذور فرد کسی قابل ہو جائے گا۔ وہ اسے کسی طرح کی محرومی کا احساس نہیں ہونے دیتے۔ بالکل اپنے بچوں کی طرح رکھا ہوا ہے۔ پیار کرتے ہیں اور اس کی ہر ضرورت کا خیال رکھتے ہیں۔"

"بہت بڑی بات ہے۔" نوید نے کہا۔

"نیک جذبہ ہے۔" ممی بولیں۔

"ایسے جذبے ہم لوگوں میں بھی پیدا ہو سکتے ہیں۔ ہم خود غرض کیوں ہیں، صرف اپنی اپنی ذاتوں کے حصار میں قید ہیں۔ وہ لوگ اپنی ذات کے خول سے نکل کر

بھی دیکھتے ہیں۔ خود جیتے ہیں اور دوسروں کو بھی جینے دیتے ہیں......"

"خیر باجی...... سب لوگ تو مسٹر اینڈ مسز تھامس نہیں ہوں گے نا۔"

"میں کب کہتی ہوں لیکن وہ لوگ محنت اور کام میں مخلص ہیں۔ وقت ضائع نہیں کرتے اور اصول کے پابند ضرور ہیں۔"

نورینہ مختلف مثالیں دینے لگی۔ نوید کبھی کبھی جرح کے انداز میں سوال ضرور کرتا...... وہ مطمئن کرنے کو تسلی سے جواب دیتی۔

لیکن یہ واقعی اس کی خوش قسمتی تھی کہ وہ ایسے لوگوں سے وہاں ملی جو ایثار و قربانی کا مرقع تھے۔ جن کی سوچیں زندگی کے متعلق مثبت تھیں۔ اس نے اسی سالہ مسز ہارڈی کے متعلق بھی سب کو بتایا۔ اس معمر عورت سے بھی وہ بہت متاثر تھی۔

"مسز ہارڈی کا خاوند جنگ عظیم میں مارا گیا تھا۔ ایک بیٹا تھا۔ وہ عین جوانی کے عالم میں ویت نام میں مارا گیا۔ مسز ہارڈی پر ان واقعات سے قیامت ضرور ٹوٹی لیکن اس نے زندہ رہنا تھا اور جب زندہ رہنا تھا تو زندگی سے نباہ کیوں نہ کرتی۔ اس نے اپنے آپ کو مصروف رکھنے کے لیے رفاہی ادارہ قائم کیا ہوا ہے۔ وہ اس عمر میں بھی لوگوں کے کام کر کے خوش ہوتی ہے...... اس کے علاوہ اس نے دو ایسے لڑکوں کو جن کا اس دنیا میں کوئی نہیں، پالا اور جوان کیا ہے۔ یہ دونوں لڑکے آرمی کے اعلیٰ افسر ہیں......"

نورینہ اپنے تاثرات بیان کر رہی تھی۔ ممی اور ڈیڈی خوش تھے کہ وہ خوش ہے...... اور زندگی سے سمجھوتہ کر لینے میں اسے ایسے لوگوں سے کافی مدد ملی ہے۔

"ڈیڈی۔" وہ ایک دم بولی۔

"جی بیٹے۔"

"ڈیڈی آپ کے پاس کتنا پیسہ ہو گا؟"

"کیوں؟" وہ ہنس پڑے۔

"ڈیڈی...... میں جانتی ہوں کہ آپ کے پاس اتنا فاضل پیسہ ہے کہ آپ کئی یتیموں کے سر پر ہاتھ رکھ سکتے ہیں۔ قوم کے کئی ہونہار طالب علموں کو تعلیم دلا سکتے ہیں جو صلاحیتیں رکھنے کے باوجود غریبی کی وجہ سے اعلیٰ تعلیم حاصل نہیں کر سکتے۔

آپ ہسپتالوں میں جا کر ایسے غریب مریضوں کی مدد کر سکتے ہیں جو پیسہ نہ ہونے کی وجہ سے علاج کی سہولتوں سے محروم ہیں اور سسک سسک کر مر رہے ہیں......"

ڈیڈی من میں منفعل ہوئے۔ ممی آہستگی سے بولیں۔ "ہم بہت سے لوگوں کی مدد کر رہے ہیں بیٹی......"

"نہیں ممی...... ایسی مدد نہیں کہ کسی کو دس روپے دیے، کسی کو بیس۔ آپ کو خدا نے بہت کچھ دے رکھا ہے۔ کوئی ٹھوس کام کیجئے۔ مسٹر و مسز تھامس کی طرح۔ مسز ہارڈی کی طرح۔"

"میں رفاہی کام کر رہی ہوں بیٹی۔"

"میں مطمئن نہیں ہوں۔" وہ بولی۔ پھر ڈیڈی کی طرف دیکھا اور مسکرا کر بولی۔ "ڈیڈی۔ آپ کی بزنس کی میں بھی ایک پارٹنر ہوں نا؟"

"ہاں۔"

"میرا حصہ۔"

"ہر سال پرافٹ تمہارے اکاؤنٹ میں جمع ہوتا ہے بیٹے۔ کچھ تمہاری ممی کی سیف میں جمع ہوتا ہے۔ وہ سب تمہارا ہے۔"

وہ خوش ہو گئی۔ اس کی آنکھوں میں چمک آ گئی۔ "میں یہاں بھی کوئی ایسا ہی کام کرنا چاہتی ہوں جیسا......"

"ہم تمہیں خوش دیکھنا چاہتے ہیں۔" ڈیڈی بولے۔

"میں خوش ہوں ڈیڈی اور خوش رہوں گی کہ خوش رہنا سیکھ لیا ہے۔ آپ میری بالکل بھی فکر نہ کریں...... اب میں بیمار پڑ کر آپ کو تنگ نہیں کروں گی......"

ممی ڈیڈی مسکرا کر اسے دیکھنے لگے۔

اور

اس رات سونے سے پہلے اس نے کئی پلان بنائے۔ وہ ممی کی طرح کی سوشل ورکر نہ بننا چاہتی تھی۔ اس کے عزائم کچھ اور ہی تھے۔ ٹھوس بنیادوں پر کام کر کے وہ مطمئن ہو سکتی تھی۔

"پتہ تو کرنا چاہیے۔"

"کس بات کا؟"

"وہاں لے جانے اور علاج کرنے میں کتنا خرچہ ہوگا۔"

"چھوڑو یار۔ احمقوں کی جنت میں رہ رہے ہو۔ صرف کرایہ بھی کرو تو ہزاروں میں بات جائے گی۔ چہ جائیکہ وہاں علاج......"

تینوں اپنے اپنے طور پر سوچ رہے تھے۔ مخلص دوست تھے۔ جاوید کی مدد کرنا چاہتے تھے۔ مقدور بھر کی بھی تھی لیکن اپنے جنجالوں میں جکڑے ہوئے یہ لوگ اتنی بڑی رقم جمع کرنے کا سوچ بھی نہ سکتے تھے۔

جمیل اپنی سائیکل کی سیٹ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے سوچوں میں گم تھا۔ ارشد کے ذہن میں بھی کئی باتیں آ جا رہی تھیں اور ہمایوں پھل کی ریڑھی کو دیکھتے ہوئے کوئی منصوبہ بنا رہا تھا۔

"ایک بات۔" جمیل نے چٹکی بجائی۔

"کیا؟" سب نے پوچھا۔

"ہم سب لون کے لیے اپلائی کر دیتے ہیں۔"

"کہاں سے لون لو گے؟"

"آفس سے۔"

اس کی بات پر ارشد نے ہلکا سا قہقہہ لگایا اور اس کے کندھے پر تھپکی دیتے ہوئے بولا۔ "زیادہ سے زیادہ کتنا لون مل جائے گا؟"

"اگر ملے بھی تو......" ہمایوں ہنسا۔

"توقع ہی فضول ہے۔ تینوں کو اکٹھے کون دے گا؟" ارشد نے کہا۔

"اور اگر مل بھی جائے تو بمشکل ایک طرف کا کرایہ بنے گا۔ باقی کے اخراجات۔"

"اور یہ بھی تو دیکھو، لون لے کر اُتارنا بھی ہے۔" ہمایوں نے کہا۔ "ہم میں سے کسی کے حالات بھی ایسے ہیں کہ اس بوجھ کے متحمل ہو سکیں......"

"یار کچھ قربانی تو دینا ہی پڑتی ہے۔" جمیل نے سائیکل کی گدی پر کُہنی ٹکا کر کہا۔

"تم اکیلی جان...... والدین بھی ماشاءاللہ اپنا بوجھ سنبھالے ہوئے ہیں۔ ایسا کر سکتے ہو...... لیکن ارشد کی طرف دیکھو یا میرا حال دیکھو۔ ایک قسط بھی کٹوانا ممکن نہ ہوگا۔ ہر تیسرے چوتھے مہینے کی تنخواہ پہلی ہی کو قرضے میں چلی جاتی ہے......"

جمیل ان کے حالات سے آگاہ تھا۔ واقعی وہ لوگ بھی بچے تھے۔

ارشد نے کہا۔ "میں جتلانا تو نہیں چاہتا لیکن بات چھیڑی ہے تو بتا ہی دوں۔ میں نے اپنی بیوی کی بالیاں اور دو انگوٹھیاں بیچ کر جاوید کو پیسہ دیا ہے...... میں یہی کر سکتا تھا۔"

"میرے پاس بھی سات آٹھ سو روپیہ تھا۔ امی نے ہمشیرہ کی شادی کے لیے جوڑا ہوا تھا۔ وہ بے بی کے لیے دے دیا اور خدا جانتا ہے کہ میں نے پیسہ واپس لینے کی نیت سے نہیں دیا......"

تینوں کے چہروں پر مایوسی کی دھند پھیل گئی۔ وہ جاوید کی مدد بھی کرنا چاہتے تھے اور کر پانے کی ہمت بھی نہ تھی۔

"کسی رفاہی ادارے سے رجوع کیا جائے۔" ارشد نے تجویز پیش کی......

"ہاں، کوئی کارکن واقف ہو تو شاید......" جمیل بولا۔

"واقف تو نہیں۔ ہمت کریں تو واقفیت بھی نکل آئے گی۔" ہمایوں نے کہا۔ "ان لوگوں کے پاس کافی فنڈ ہوتے ہیں۔ ہو سکتا ہے کوئی ادارہ بے بی کے علاج کا بیڑا اُٹھا ہی لے۔"

"خیال بلبلہ بر آب ہی ہے۔"

"پھر بھی۔"

"ہاں۔ کوشش کرنے میں حرج ہی کیا ہے۔"

"ایک بات کا دھیان رکھنا۔"

"کس کا؟"

ہمایوں، ارشد اور جمیل بے بی کو دیکھ کر آئے تو بے حد متاثر تھے۔ اپنی اپنی سائیکلوں کے ساتھ ساتھ چلتے وہ باتیں کر رہے تھے۔ شام ہونے کو تھی۔ بازار میں کافی گہما گہمی تھی۔ موسم بدل چکا تھا۔ بہار کے اثرات نمایاں تھے۔ کھلے کھلے موسم کی فضا بڑی خوشگوار تھی لیکن تینوں دوست متفکر نظر آ رہے تھے۔ بازار کی گہما گہمی سے بے خبر باتیں کر رہے تھے۔

"توبہ...... توبہ...... دیکھا نہیں جاتا۔ بیچاری بچی ذرا ذرا سی حرکت پر تڑپ جاتی ہے۔"

"سارا گوشت سکڑ کر اکٹھا ہو گیا ہے۔"

"اندر سے ٹنڈن بھی سکڑ گئے ہیں۔"

"اسی لیے تو اتنی تکلیف ہے۔"

"اس سے تو اچھا تھا، مر ہی جاتی۔"

"یار یہ کسی کے اختیار کی بات تھوڑا ہی ہے۔ میرا تو کلیجہ ہل گیا۔ جب جاوید نے کہا، یار دعا کرو۔ اس تکلیف سے بے بی کو نجات مل جائے۔ خدا اسے اٹھا لے......"

"ہاں میری آنکھوں میں تو آنسو آ گئے تھے۔"

"کرے بھی کیا بیچارہ...... گھر کی حالت دیکھی ہے۔"

"اس کے پاس تو اب پھوٹی کوڑی بھی نہیں۔"

"الٹا قرض دار ہی ہے۔"

"آفس سے لون لیا تھا......"

"ہاں...... وہ تو ایک ماہ بھی نہیں چلا......"

"کچھ کرنا چاہیے یار...... آخر دوست کس دن کے لیے ہوتے ہیں......"

"ہاں...... کرنا تو چاہیے۔ میں بھی یہی سوچتا ہوں لیکن اپنے پلے تو کچھ ہے ہی نہیں۔ جانتے ہو میری اماں کتنے عرصے سے بیمار ہیں۔"

"میڈیکل کی سہولت بھی تو دفتر سے نہیں ملتی۔"

"یار شکر کرو تنخواہ بھی مل جاتی ہے۔ بیروزگاری سے تو نجات ملی ہوئی ہے۔"

"ہاں تنخواہیں نسبتاً اچھی ہی ہیں ہماری۔"

"بس گزارے کے لیے ہی ہیں۔ گزارے کے علاوہ ہم تو کچھ سوچ بھی نہیں سکتے۔"

"اپنا بھی یہی حال ہے۔ کپڑے لتّے کا تو کبھی سوچا ہی نہیں۔ بیگم کی اماں کا خدا بھلا کرے۔ ہر سیزن میں کپڑے بنوا دیتی ہیں۔"

"اِدھر تو یہ بات بھی نہیں دوست...... الٹا بوڑھے ساس سسر کی کفالت کرنا پڑتی ہے۔"

"بھئی مجبوری ہے...... جیتے جی تو کوئی ان کا گلا نہیں گھونٹ سکتا۔ بیٹا ہے، پر پوچھتا بھی نہیں...... بیوی کو لے کر الگ ہو گیا ہے۔"

"اس کا حال بھی خراب ہی ہے۔"

باتیں کرتے کرتے تینوں چوراہے تک آ گئے۔ جمیل نے یہاں سے دائیں ہاتھ والی سڑک پر اترنا تھا۔

وہ رُک کر سڑک کے کنارے کھڑا ہو گیا۔ ارشد اور ہمایوں بھی رُک گئے۔

"پھر کیا سوچا ہے؟"

"کس کا؟"

"جاوید کا؟"

"اپنی تو سمجھ میں کچھ نہیں آتا...... بے بی کا علاج یہاں ہوتا نہیں اور امریکہ، جرمنی یا انگلینڈ بھیجنے کا سوچا بھی نہیں جا سکتا۔ کیا کیا جائے؟"

104

"پتہ تو کرنا چاہیے۔"

"کس بات کا؟"

"وہاں لے جانے اور علاج کرنے میں کتنا خرچہ ہوگا۔"

"چھوڑو یار۔ احمقوں کی جنت میں رہ رہے ہو۔ صرف کرایہ بھی کرو تو ہزاروں میں بات جائے گی۔ چہ جائیکہ وہاں علاج......"

تینوں اپنے اپنے طور پر سوچ رہے تھے۔ مخلص دوست تھے۔ جاوید کی مدد کرنا چاہتے تھے۔ مقدور بھر کی بھی تھی لیکن اپنے جنجالوں میں جکڑے ہوئے یہ لوگ اتنی بڑی رقم جمع کرنے کا سوچ بھی نہ سکتے تھے۔

جمیل اپنی سائیکل کی سیٹ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے سوچوں میں گم تھا۔ ارشد کے ذہن میں بھی کئی باتیں آ جا رہی تھیں اور ہمایوں پھل کی ریڑھی کو دیکھتے ہوئے کوئی منصوبہ بنا رہا تھا۔

"ایک بات۔" جمیل نے چٹکی بجائی۔

"کیا؟" سب نے پوچھا۔

"ہم سب لون کے لیے اپلائی کر دیتے ہیں۔"

"کہاں سے لون لو گے؟"

"آفس سے۔"

اس کی بات پر ارشد نے ہلکا سا قہقہہ لگایا اور اس کے کندھے پر تھپکی دیتے ہوئے بولا۔ "زیادہ سے زیادہ کتنا لون مل جائے گا؟"

"اگر ملے بھی تو......" ہمایوں ہنسا۔

"توقع ہی فضول ہے۔ تینوں کو اکٹھے کون دے گا؟" ارشد نے کہا۔

"اور اگر مل بھی جائے تو بمشکل ایک طرف کا کرایہ بنے گا۔ باقی کے اخراجات۔"

"اور یہ بھی تو دیکھو، لون لے کر اُتارنا بھی ہے۔" ہمایوں نے کہا۔ "ہم میں سے کسی کے حالات بھی ایسے ہیں کہ اس بوجھ کے متحمل ہو سکیں......"

105

"یار کچھ قربانی تو دینا ہی پڑتی ہے۔" جمیل نے سائیکل کی گدی پر کُہنی ٹکا کر کہا۔

"تم اکیلی جان...... والدین بھی ماشاءاللہ اپنا بوجھ سنبھالے ہوئے ہیں۔ ایسا کر سکتے ہو...... لیکن ارشد کی طرف دیکھو یا میرا حال دیکھو۔ ایک قسط بھی کٹوانا ممکن نہ ہوگا۔ ہر تیسرے چوتھے مہینے کی تنخواہ پہلی ہی کو قرضے میں چلی جاتی ہے......"

جمیل ان کے حالات سے آگاہ تھا۔ واقعی وہ لوگ بھی بچے تھے۔

ارشد نے کہا۔ "میں جتلانا تو نہیں چاہتا لیکن بات چھیڑی ہے تو بتا ہی دوں۔ میں نے اپنی بیوی کی بالیاں اور دو انگوٹھیاں بیچ کر جاوید کو پیسہ دیا ہے...... میں یہی کر سکتا تھا۔"

"میرے پاس بھی سات آٹھ سو روپیہ تھا۔ امی نے ہمشیرہ کی شادی کے لیے جوڑا ہوا تھا۔ وہ بے بی کے لیے دے دیا اور خدا جانتا ہے کہ میں نے پیسہ واپس لینے کی نیت سے نہیں دیا......"

تینوں کے چہروں پر مایوسی کی دھند پھیل گئی۔ وہ جاوید کی مدد بھی کرنا چاہتے تھے اور کر پانے کی ہمت بھی نہ تھی۔

"کسی رفاہی ادارے سے رجوع کیا جائے۔" ارشد نے تجویز پیش کی......

"ہاں، کوئی کارکن واقف ہو تو شاید......" جمیل بولا۔

"واقف تو نہیں۔ ہمت کریں تو واقفیت بھی نکل آئے گی۔" ہمایوں نے کہا۔ "ان لوگوں کے پاس کافی فنڈ ہوتے ہیں۔ ہو سکتا ہے کوئی ادارہ بے بی کے علاج کا بیڑا اُٹھا ہی لے۔"

"خیال بلبلہ بر آب ہی ہے۔"

"پھر بھی۔"

"ہاں۔ کوشش کرنے میں حرج ہی کیا ہے۔"

"ایک بات کا دھیان رکھنا۔"

"کس کا؟"

"جاوید کو پتہ نہ چلے۔ آج کل بہت چڑچڑا ہوا ہے۔ احساس کمتری میں مبتلا ہے بیچارہ......"

"ہاں، میں نے بھی محسوس کیا ہے۔ اس کا ذہن زیر بار رہتا ہے۔"

"بھئی بچی کی پریشانی کچھ کم تو نہیں۔ ہمارا دل دکھ جاتا ہے۔ وہ تو باپ ہے۔"

"باپ بھی تو اس جیسا کوئی ہو گا۔ جان تھی بچی میں۔ حیران ہوں، وہ اپنے حواس میں اب تک کیسے ہے۔ بچی کی تکلیف تو دیکھی نہیں جاتی۔"

"حواس میں کیا ہے۔ دیکھتے نہیں اس کی حالت، مریض لگتا ہے۔"

"پھر بھی دفتر آ رہا ہے۔"

"کیا کرے غریب...... لون لے کر جان پھنسالی ہے۔ دفتر تو آنا ہی پڑے گا۔"

"بیچارہ...... کیا کرتا......"

"جی چاہتا ہے۔ جاوید کے سارے دُکھ بانٹ لوں۔"

"یاروں کا یار ہے۔ اتنا پیارا اور مخلص دوست۔ پر کیا کریں، سمجھ نہیں آتا......"

سڑکوں کے کنارے کی روشنیاں جل اٹھی تھیں۔ اندھیرا کافی پھیل گیا تھا اور بہار کی پُر بہار رات اترنا شروع ہو گئی تھی۔ شہر کے اس گنجان آباد علاقے میں بھی بہار کے پھولوں کی مہک فضا میں رچی تھی۔

تینوں دوست بغیر کسی فیصلے کے اپنے اپنے راستوں پر ہو لئے۔ سب کے دل دکھ رہے تھے۔

لیکن

بے بس تھے۔ کچھ نہ کر سکتے تھے۔

جاوید نے کاٹن کا پیکٹ ڈیٹول کی شیشی۔ ڈریسنگ کے لیے مرہم اور سوتی پٹیاں خرید کر بل ادا کیا اور ساری چیزیں لفافے میں ڈلوا کر کاؤنٹر سے پلٹا۔ دکان کے دروازے سے باہر نکل رہا تھا کہ اسے کچھ ہی فاصلے پر نورینہ نظر آئی۔

وہ گاڑی سے نکل کر ادھر ہی آ رہی تھی۔

جاوید ایک لمحہ کو ساکت ہو گیا۔ نورینہ کو اس نے پہلی نظر ہی میں پہچان لیا تھا۔ تھی وہی...... لیکن پہلے سے کہیں زیادہ اچھی لگ رہی تھی۔ چہرہ کھلے ہوئے پھول کی طرح تھا۔ بال چمکیلے اور سیاہ تھے۔ پہلے پشت پر بکھرے ہوتے تھے۔ اب شاید اس نے کٹوا لیے تھے۔

وہ دکان سے باہر آ گیا۔

نورینہ کی نگاہ اس پر پڑی۔ وہ برابر والی دکان میں داخل ہونے کو تھی۔ اچانک اسے دیکھ لیا۔

چند لمحے وہ حیرانگی سے اسے تکتی رہی۔ کھلی کھلی آنکھوں سے اسے تکتی رہی۔

جاوید نے جلدی قدم بڑھایا۔ کہیں سے خوف ذہن میں آ دھمکا۔ نورینہ کے اس طرح تکنے سے وہ یہی سمجھا کہ اپنے منگیتر کے حوالے سے اسے پاگلوں کی طرح تک رہی ہے۔ اس نے جلدی سے بھاگ جانا چاہا۔

تیز قدم اٹھاتے وہ سائیکل کی طرف آیا جو دکان کے قریب ہی دیوار کے ساتھ کھڑی کی ہوئی تھی۔

"ہیلو جاوید......" نورینہ اس کی پشت پر آ چکی تھی۔

ہڑبڑا کر اس نے نورینہ کو دیکھا۔

نورینہ نے پھر اک نگاہ اس پر ڈالی۔ یہ نگاہ بھرپور تھی۔

"آپ...... آپ جاوید ہی ہیں نا......" اس نے چند لمحے اس کا جائزہ لینے کے بعد پوچھا۔

"جی......" وہ بولا۔ "کہئے کیا حال ہے۔ کب واپس آئیں؟"

لیکن اس کی بات کا جواب دینے کی بجائے نورینہ نے حیرانگی سے کہا۔ "آپ کو کیا ہوا ہے؟"

وہ اک گہری سانس لے کر رہ گیا۔

"بیمار ہیں کیا؟" وہ جلدی سے بولی۔

جاوید نے سر جھکا کر سائیکل کے پیڈل پر پیر مارا۔

نورینہ اسے حیرانگی سے اب بھی تک رہی تھی۔ وہ خاصا گرانڈیل جوان تھا...... خوبصورت اور بے پناہ مردانہ کشش رکھتا تھا۔ اب تو اسے یوں لگ رہا تھا...... جیسے وہ جاوید نہیں، جاوید کا خاکہ تک رہی ہے۔

بہت کمزور لگ رہا تھا۔ آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے بڑے نمایاں تھے۔ رنگ زرد تھا۔ زردی میں سیاہی گھل گئی تھی۔ ہونٹ خشک اور بے رنگ تھے۔ بالوں اور مونچھوں کے بال بھی بے رنگ اور اڑے اڑے تھے۔

اس نے شاید آج شیو بھی نہ کی ہوئی تھی۔ اس لیے خاصا بیمار لگ رہا تھا۔

"کیا بات ہے۔" وہ بولی۔ "بتا نہیں رہے، کیا بیمار ہیں آپ؟"

"نہیں......"

"پھر یہ حالت......"

"میری بچی بیمار ہے۔"

"اوہو......" وہ ہلکی سی مسکراہٹ ہونٹوں پر پھیلاتے ہوئے بولی۔ "آپ کو بچی سے واقعی بہت محبت ہے۔"

جاوید نے صرف اسے دیکھا۔

"بیمار بیٹی ہے اور حلیہ باپ کا ایسا ہو رہا ہے۔ جیسے ابھی ابھی ہوسپٹل سے فرار ہوئے ہوں۔"

جاوید نے اس کی بات کا جواب نہیں دیا۔ سائیکل سیدھی کی اور بولا۔

"مجھے جلدی گھر پہنچنا ہے......"

"ضرور ضرور...... خدا کرے آپ کی بچی جلد اچھی ہو جائے۔" نورینہ نے کہا۔

"جاوید کے چہرے پر کرب کی ایک لہر دوڑ گئی...... لیکن اس نے بے بی کے متعلق نورینہ کو کچھ نہیں بتایا۔"

"کبھی آئیے گا۔" نورینہ نے قدم اٹھاتے ہوئے رسمی سا جملہ کہا۔

"خدا حافظ۔" جاوید نے پیڈل پر پیر رکھا۔

"خدا حافظ۔" نورینہ بیگ جھلاتی کیمسٹ کے برابر والی جنرل مرچنٹ کی دکان کی طرف چل دی۔

اس کے ذہن میں جاوید کا سراپا عکس انداز تھا۔ پہلے کے جاوید اور اس جاوید میں زمین و آسمان کا فرق آ چکا تھا۔

وہ

سوچ رہی تھی

کہ

واقعی جاوید کو اپنی بچی سے شدید محبت ہے۔ اس نے نورینہ یا اس کے ڈیڈی کی پیشکش کو ٹھکرایا تھا تو غلط نہیں کیا تھا۔ اس عظیم انسان کے لیے اس کے سینے میں عقیدت کے جذبات مچلنے لگے......

دکان سے اس نے اپنی مطلوبہ چیزیں خریدیں۔ ان دنوں اس نے کچھ سوشل ایکٹوٹیز شروع کر رکھی تھیں۔

وہ لوگوں کے دکھ بانٹ کر انمول خوشیوں سے اپنا دامن بھر رہی تھی۔

وہ ایک بے سہارا بیوہ عورت کی جوان بیٹی کی شادی کے سلسلے میں خرید و

فروخت کر رہی تھی۔

یہ بیوہ عورت اسے سرِ راہ ملی تھی...... اور دامن سوال پھیلایا تھا......

نورینہ نے بذاتِ خود اس کی تحقیق کی تھی۔

وہ عورت واقعی مستحق تھی۔

بہت غریب لیکن بے حد شریف اور حساس عورت تھی۔ پورے محلے نے اس کی گواہی دی تھی۔ جوان بیٹی کا بار اتارنا تھا۔ رشتہ طے کر لیا تھا لیکن ایک جوڑا تک پاس نہ تھا جو دے کر بیٹی کو اپنی دہلیز سے بدا کرتی۔

نورینہ نے اپنے اکاؤنٹ سے کچھ پیسہ نکلوایا تھا اور لڑکی کے لیے چھوٹی موٹی چیزیں اکٹھی کر رہی تھی۔

جب بھی وہ کوئی چیز اس بیوہ اور بے سہارا یتیم لڑکی کو دینے جاتی تو ماں بیٹی کے چہرے پر خوشی و مسرت کا جو رنگ آتا، نورینہ کے لیے وہی صدہا خوشیوں کا باعث بن جاتا۔

کمپوڈر ٹانگ اور ہاتھ کی ڈریسنگ کر کے گیا تو جاوید گھر کے اندر آیا۔ ڈریسنگ کرواتے بے بی اتنا روتی اور اتنا تڑپتی تھی کہ اس سے بچی کی حالت زار دیکھی نہ جاتی تھی۔ زخم تو اب معمولی سے تھے لیکن اعضا ہلانے جُلانے سے جو تکلیف ہوتی تھی، وہ بچی کے لیے ناقابلِ برداشت تھی۔

اس کے پاس تو ڈریسنگ کے وقت فاخرہ بھی نہ بیٹھتی تھی۔ دوسرے کمرے یا کچن میں چلی جاتی۔ جب بے بی کی چیخیں تیز ہوتیں تو وہ کانوں میں انگلیاں دے لیتی یا غسل خانے میں پانی کا نل پوری رفتار سے ٹین کی بالٹی میں کھول دیتی۔

جاوید تو پاس ٹھہرتا ہی نہیں تھا۔ تکلیف تو رہی الگ وہ تو بچی کے چہرے کو بھی نہ دیکھ سکتا تھا۔ اس سے باتیں بھی نہ کرتا تھا۔ کتنی بار اس نے سجدے میں گر کر دعا مانگی تھی۔

"میرے مالک یہ دُکھ اور تکلیف میری ہمت سے باہر ہیں، تو اتنا کرم کر اس بچی کو اٹھا لے...... اُسے اٹھا لے...... یہ زندہ نعش اب مجھ سے نہیں دیکھی جاتی...... میں بہت عاجز ہوں میرے مالک۔ اس بچی کو اٹھا لے...... موت دے دے اسے...... مر جائے یہ......"

لیکن

اللہ تعالیٰ کو جانے کون سی مصلحت منظور تھی۔ بار غم جاوید اور فاخرہ کی قوت برداشت سے زیادہ تھا۔ خود فاخرہ بھی دکھ اور زخموں سے چور چور دل سے ایسی ہی دعائیں مانگا کرتی تھی...... وہ جانتی تھی کہ بچی کا علاج ممکن ہے لیکن ممکن کچھ لوگوں

کے لیے ناممکن بھی تو ہوتا ہے۔

بچی سسک سسک کر چپ ہو گئی تو جاوید صحن میں آگیا۔ بے بی پلنگڑی پر برآمدے میں پڑی تھی۔

"ابو......" بے بی نے اسے دیکھتے ہی پکارا۔

"جی بچے۔" وہ دل کڑا کر کے اس کے قریب آگیا۔

"ابو۔" بے بی کی سسکی ابھی تک حلق میں اٹکی تھی۔

"ہوں۔"

"میں کب ٹھیک ہوؤں گی ابو......"

جاوید کے دل کو دھچکا لگا۔ جی بھر آیا لیکن ہمت کر کے بولا۔ "بس تھوڑے دن اور۔ بالکل ٹھیک ہو جاؤ گی۔"

"ابو......"

"ہوں۔"

"ابو یہ کمپوڈر ہے نا؟"

"ہاں۔"

"بڑی درد کرتا ہے۔ آپ میری پٹی لگایا کریں نا۔"

جاوید چپ ہو گیا۔ نچلے ہونٹ کے سرے دانتوں تلے دباتا رہا۔ وہ بچی کو کیسے بتاتا کہ وہ تو اس پر نگاہ ڈالنے کی جرأت بھی بڑی جرأت سے کر پاتا ہے۔ پٹی کیسے لگا سکتا ہے۔

"ابو......" بے بی کے سینے سے ایک اور سسکی ٹوٹی۔

"جی بیٹے......" وہ موڑھے پر پلنگڑی کے قریب بیٹھا تھا لیکن نگاہیں صحن میں پڑی چارپائی پر تھیں جس پر فاخرہ نے دھلے ہوئے کپڑے رسی سے اتار کر ڈال دیئے تھے۔ وہ سوچوں میں مستغرق تھا کہ بے بی نے پھر روہانسی آواز میں کہا۔ "ابو......"

"جی بیٹے۔"

"ابو...... میں آپ کو اب اچھی نہیں لگتی......"

"کیوں۔ کیوں میرے بچے...... کیوں؟" جاوید کے دل پر چوٹ پڑی۔ بے اختیاری سے بچی کو پکڑا۔

بچی تکلیف سے تڑپی...... لیکن باپ کے ہاتھوں کا لمس سکون دے گیا۔ بمشکل بولی۔ "اب...... اب آپ مجھے پیار نہیں کرتے ابو...... میرے ساتھ باتیں بھی نہیں کرتے...... مجھے اٹھاتے بھی نہیں......"

"اوہ...... بے بی......" جاوید نے دونوں ہاتھوں پر سر گرا لیا۔ بے بی باتیں کئے گئی۔

جاوید کے صبر و ضبط کے بند ٹوٹ گئے۔

وہ ہاتھوں میں منہ چھپا کر اتنی بے اختیاری سے رو دیا کہ کچن میں بچی کے لیے کھچڑی بناتی فاخرہ دوڑ کر آگئی۔

اور برابر والے گھر سے مینی کی ماں لکڑی کے ڈبے پر چڑھ کر دیوار سے جھانکنے لگی۔

"کیا ہوا ہے۔ اللہ آپ تو...... بالکل...... بالکل...... ہی......" فاخرہ کے ہاتھ سے چمچ گر گیا۔ جاوید کو دلاسہ دیتے ہوئے وہ خود بھی ضبط نہ کر پائی۔

اور

ہچکیوں سے رونے لگی۔

مینی کی ماں پہلے تو پوچھتی رہی...... "کیا ہوا...... کیا ہوا......"

جب کوئی جواب نہ ملا۔

تو

دیوار سے اُتر کر دروازے کے راستے ان کے ہاں آگئی۔ سامنے والے گھر سے بی اماں بھی رونے کی آواز سن کر لپکیں۔

جاوید۔

آنکھیں پونچھتا چیخوں کا گلا حلق ہی میں گھونٹتا کمرے میں چلا گیا۔ بستر پر اوندھا پڑ کر وہ کتنی ہی دیر بے آواز روتا رہا۔

وہ

کیا کر سکتا تھا۔

وہ

کیا کرے

اسے کچھ سمجھ نہ آتا تھا۔

رات جب بے بی نیند کی گولی کھا کر سو گئی تو فاخرہ نے قرآنی آیات پڑھ کر اس پر پھونک ماری...... جاوید پلنگ میں پڑا تھا۔ اسے فاخرہ پر بڑا ترس آیا۔ چار پانچ ماہ میں وہ ہڈیوں کا ڈھانچہ بن گئی تھی۔

"بیچاری بے بی۔" فاخرہ پلنگ پر لیٹتے ہوئے بڑبڑائی۔ "خدا ہی رحم کرے۔"

جاوید چپ لیٹا رہا...... اسے تو اب ایسی دعائیں مضحکہ خیز لگتی تھیں۔ کئی بار وہ کلمۂ کفر بھی زبان سے نکال دیتا تھا۔ سادہ لوح فاخرہ کانپ کر رہ جاتی...... وہ ہمیشہ اسے ایسی باتیں منہ سے نہ نکالنے کی تلقین کرتی۔

"جاوید۔" اس نے پکارا۔ وہ خاصی دلبرداشتہ ہو رہی تھی۔

"ہوں۔"

"کچھ نہیں بنا۔"

"کس بات کا؟"

"پیسے کا۔"

جاوید چڑ گیا۔ دکھ انتہا کو پہنچا تو بولا۔ "میرے باپ دادا کی کان نہیں پیسوں کی۔"

"ہائے اللہ...... آپ کیسی باتیں کرتے ہیں...... تنگ آگئے ہیں۔ اس طرح کرنے سے تو کچھ نہیں ہوگا۔ یہ مصیبت پڑی ہے تو جھیلنا ہی پڑے گی۔"

"کب تک...... آخر کب تک جھیلوں گا......" وہ جیسے کراہا۔ "مجھے تو کچھ نہیں آتا۔ کیا کروں، ڈاکہ ماروں، کسی کو قتل کر کے پیسہ لاؤں۔ خدایا...... تو بے بی کو اٹھالے میرے مولا......"

آنسوؤں سے رندھی آواز حلق ہی میں اٹک گئی۔ فاخرہ چپ رہی۔ بچی کی اذیت دیکھ دیکھ کر شاید اس کے دل سے بھی یہی دعا نکلتی تھی...... چند لمحے وہ بڑا جذباتی ہو گیا۔ آنسو بھری آنکھوں اور کانپتے ہاتھوں کا پیالہ سا بنائے وہ خدا سے یہی دعا مانگتا رہا۔

فاخرہ پلو سے آنسو پونچھنے لگی۔ پھر بولی۔ "بس کیجئے نا۔ اس طرح کرنے سے کچھ نہیں بنے گا...... بے بی کو خود تو ہم مار نہیں سکتے۔"

"میں اسے اس حال میں زندہ بھی نہیں دیکھ سکتا۔ میں اس کے لیے کچھ نہیں کر سکتا...... حالانکہ اس کا علاج ہو سکتا ہے۔ فاخرہ وہ پھر پہلی سی بے بی بن سکتی ہے......"

"ہاں...... ڈاکٹر یہی کہتے ہیں۔"

"لیکن ہماری غریبی تمسخر اڑاتی ہے۔ ہم اپنی جان سے زیادہ عزیز بچی کے لیے کچھ نہیں کر سکتے۔ ہم کتنے بے بس اور مجبور ہیں فاخرہ...... کبھی کبھی تو میرا جی چاہتا ہے۔ کسی سیٹھ کی تجوری توڑ کر روپیہ اڑا لاؤں۔ کوئی بہت بڑا فراڈ کروں۔ کسی بینک سے دوسرے کی رقم دھوکے سے نکلوا لوں...... کسی طرح...... کسی طرح اپنی بے بی کا علاج کروا لوں......"

فاخرہ سسکیاں بھرنے لگی۔

"میں...... میں آج کل انہی خطوط پر سوچ رہا ہوں فاخرہ...... یا تو...... یا تو کہیں سے رقم حاصل کر لوں گا...... یا بے بی...... کو قتل کر دوں گا۔"

"ہائے اللہ" فاخرہ نے سینے پر ہاتھ مار کر جاوید کی طرف دیکھا۔ وہ بالکل حواس میں نہیں لگ رہا تھا۔ آنکھیں سرخ انگارہ تھیں اور بال پریشان اور بکھرے ہوئے تھے۔ اس کی سرخ و سپید رنگت زردی مائل سیاہی میں بدل گئی تھی۔

"خدا کے لیے جاوید ایسی فضول باتیں نہ کریں۔ عذاب الٰہی پہلے ہی ہم پر نازل ہے۔ ایسی باتوں سے اس عذاب کو اور نہ بڑھایئے۔"

"تو پھر میں کیا کروں......" وہ فرطِ جذبات سے بھرائی آواز میں بولا۔

فاخرہ کوئی جواب نہ دے سکی۔ صرف اسی قدر کہا۔ "اللہ پر بھروسہ کیجئے...... شاید...... شاید......"

"بس اب آگے کچھ نہ کہنا...... کوئی معجزہ نہیں ہوگا۔ پیسوں کی بارش بھی نہیں ہوتی اور میرے تمہارے وسائل بھی نہیں کہ کہیں سے آپوں آپ بندوبست ہو جائے گا۔"

وہ چپ ہو گئی۔

چند لمحے وہ سسکتا رہا پھر خود ہی بولا۔ "بے بی کے لیے تو میری جان بھی حاضر ہے...... کوئی میری جان لے کر بھی اس کا علاج کروا دے۔ اسے پہلی سی بے بی بنا دے۔ اس کی معذوری ختم کر دے۔ اس کی تکلیفیں رفع کر دے تو میں بخوبی سب کچھ کر سکتا ہوں۔"

"جان تو میں بھی قربان کر سکتی ہوں۔" وہ رو دی...... "لیکن ایسا ہو کیسے سکتا ہے۔ کون ہمارا ہاتھ تھامے گا۔ کون ہماری مدد کرے گا......"

جاوید نے اٹھ کر پنکھا کھول دیا...... وہ خاصا حبس اور گھٹن محسوس کر رہا تھا۔ شاید یہ حبس اور گھٹن اس کے اندر پھیل رہا تھا۔

کلب کے احاطہ سے گاڑی نکلی تو نور احمد نے گاڑی کے شیشے نیچے کر دیئے۔ نورینہ کی ممی نے بھی اپنی طرف کا شیشہ گرا دیا۔

"آج موسم بڑا تپ رہا ہے۔"

"ہاں کچھ گرمی محسوس ہو رہی ہے۔"

"آپ نے سوٹ خوامخواہ پہن لیا تھا۔"

"ہاں اب یہ ٹراپیکل سوٹ بھی نہیں پہنے جاتے۔"

"میں نے تو اپنے ہلکے لباس نکال لیے ہیں۔"

"عقل مند ہو۔"

"بالکل۔"

"دونوں باتیں کرتے سڑک پر آگئے۔ گاڑی صاف ستھری سڑک پر تیرنے سی لگی۔"

ممی باتیں کر رہی تھی۔ موسم کی باتیں آج کے فنکشن پر مڑ گئیں اور پھر فنکشن کے حوالے سے مسز زبیدہ ناصر کا ذکر آگیا۔

"ہاں میں انہیں جانتا ہوں۔ سفید ساڑھی پہن رکھی تھی۔ گلے میں پرلز تھے......"

"ہاں ہاں وہی۔"

"ناصر سے بھی میری صاحب سلامت ہے۔"

"اچھے لوگ لگتے ہیں۔"

"کیوں خیر تو ہے...... کوئی خاص بات؟"

"ہے تو خاص بات۔"

"یعنی......"

"زبیدہ نورینہ کا پوچھ رہی تھی۔"

"خیریت؟"

"بھئی اس کا بیٹا ہے آرمی میں میجر......"

"ہوں......"

"لوگ اچھے لگتے ہیں۔ لڑکے کا پتہ کروایا جا سکتا ہے۔"

نور احمد نے وہیل پر دونوں ہاتھ رکھے گردن موڑ کر بیوی کو دیکھا، اک گہری سانس لے کر بولے۔ "بہتر ہے ابھی تم یہ چکر نہ ہی چلاؤ۔"

"کیوں؟"

"نورینہ کے لیے یہی بہتر ہے۔"

"کیا؟"

"بھئی ان دنوں وہ اپنے ہی کاموں میں لگی ہوئی ہے۔ دیکھتی نہیں ہو کتنی خوش رہتی ہے۔ چھوٹی چھوٹی خوشیاں سمیٹتی پھرتی ہے۔"

"تو کیا...... اس کی شادی نہیں کرنا ہمیں......"

"کر لیں گے۔ مجھے تو اب اس خیال ہی سے ہول آتا ہے۔ بہت دکھ جھیلے ہیں میری بچی نے...... اب وہ خوش ہے تو اسے خوش رہنے دو، شادی بھی ہو جائے گی۔ رشتوں کی کمی نہیں۔ نورینہ میں کوئی کمی نہیں...... دولت...... شکل...... کردار...... سب کچھ ہے...... بس قسمت......"

"یہ چیزیں دیکھتے رہے تو لڑکی کی عمر یونہی گزر جائے گی۔ چوبیسویں سال میں ہے وہ......"

"بس قدرت کے کام ہیں نا...... تم نے جتنی جلدی گھر بار کی کرنا چاہا تھا......

اتنی ہی دیر ہو رہی ہے۔"

"اب اگر موزوں رشتہ مل جائے تو......"

"میری تو یہی رائے ہے کہ فی الحال اسے ڈسٹرب نہ کرو۔"

"آپ نے اسے کھلی چھٹی دے دی ہے نا......"

"وہ کوئی بُرا کام نہیں کرتی...... پچھلے دنوں بتا رہی تھی کہ ایک بے سہارا ایتیم لڑکی کی اس نے شادی کی ہے۔"

"جی ہاں...... بینک میں روپیہ اس کے ڈسپوزل پر ہے۔"

"وہ اتنی ناسمجھ نہیں کہ پیسہ اجاڑے گی۔ اس نے مجھے سارا حساب دیا ہے۔ اتنی رقم تو بیگم تم سال میں اپنے ہار سنگار پر ہی خرچ کر دیتی ہو۔"

"ہونھ...... بیٹی نے باپ کو بھی ہم خیال بنا لیا ہے۔"

"نیک خیال ہیں بچی کے۔ مجھے خوشی ہوتی ہے...... پھر وہ کتنی بہلی رہتی ہے۔ آج کل ہوسپٹل میں نادار مریضوں کو دیکھنے جاتی ہے۔ کسی کے لیے پھول لے جاتی ہے۔ کسی کے لیے کھانے پینے کا سامان، کسی کے لیے کتابیں، کسی کے لیے دوائیاں...... بہت پُر سکون ہے وہ آج کل۔"

"زبیدہ۔"

"میں نورینہ کی شادی کے خلاف تھوڑا ہی ہوں لیکن میں بچی کو اب کوئی ذہنی دھچکا نہیں دینا چاہتا...... کیا زبیدہ کو معلوم ہے کہ اسے طلاق ہو چکی ہے اور اس کے بعد اس کا منگیتر ایکسیڈنٹ میں مر چکا ہے۔ اس کے بعد وہ جاوید میں دلچسپی لیتی رہی ہے؟"

نورینہ کی ممی نے ناگواری سے شوہر کو دیکھا اور بولیں۔

"ساری تفصیلات اسے بتانا ضروری ہیں کیا؟ اور یہ جاوید والا شوشہ آپ خوامخواہ ہی نورینہ سے وابستہ کر دیں گے۔"

"تم عورت ہو کر نہیں سمجھتیں...... نورینہ جاوید کو کتنا پسند کرنے لگی تھی۔"

وہ چپ ہو گئیں...... گاڑی کی کھڑکی سے باہر دیکھنے لگیں جہاں رات کی تاریکی

پھیلی ہوئی تھی...... دور مکانوں کی بتیاں جل رہی تھیں اور سڑک کے کنارے لگی مرکری ٹیوبیں جل رہی تھیں۔

مین روڈ سے گاڑی دائیں ہاتھ کی سڑک پر اتر گئی۔ پھر دو فرلانگ پر بائیں ہاتھ کی سڑک پر دوڑنے لگی۔

نورینہ کی ممی کچھ سوچتے ہوئے بولیں۔ "میں نے زبیدہ ناصر کو چائے پر بلایا ہے۔ اس کا بیٹا بھی چھٹی پر آیا ہوا ہے۔"

"ہوں۔"

"فی الحال رشتے کی کوئی بات نہیں ہوئی...... وہ تو میں نے اندازہ ہی کیا ہے کہ وہ انٹرسٹڈ ہے۔"

"پھر......"

"وہ لوگ چائے پر آئیں گے۔ نورینہ بھی مل لے گی۔ پھر دیکھیں گے۔"

"جیسے تمہاری مرضی...... لیکن ایک بات......"

"کیا؟"

"نورینہ پر کسی طور ظاہر نہ ہو کہ رشتے کا سلسلہ چلا ہے۔ وہ پھر اپ سیٹ ہو گی تو کون سنبھالے گا......"

"نہیں ہو گی۔ ان دنوں ماشاءاللہ خاصی صحت مند ہو رہی ہے۔ خوب چہکتی پھرتی ہے۔"

"زندہ رہنے کا جو ڈھنگ اس نے سیکھا ہے، تم پھر فراموش نہ کروا دینا۔"

وہ غصے سے بولیں۔ "میں اس کی دشمن ہوں نا۔ سارے درد تو آپ کے ہی دل میں جاگ رہے ہیں...... میں بھی ماں ہوں، اسے شاد و آباد دیکھنا چاہتی ہوں۔"

"جذباتی مت بنو...... میں جانتا ہوں تم ماں ہو...... اور مجھ سے شاید زیادہ ہی اسے پیار کرتی ہو لیکن......"

"اس کی شادی کی بات نہ کرو۔"

"ہاں فی الحال نہ کرو...... اسے اچھی طرح اپنا آپ ایڈجسٹ کر لینے دو۔ اسے

ننھی منی خوشیاں دامن میں بھر لینے دو۔ اس کا احساس محرومی مٹ لینے دو......"

وہ چپ ہو گئیں۔

"اس نے جو پلان بنائے ہیں، ان پر عمل پیرا ہو کر اسے اتنی خوشیاں ملیں گی کہ ذات کا کرب جو ہمیشہ اس پر وار کرتا آیا ہے، مٹ جائے گا...... وہ اپنی محرومی کو بھلا ڈالے گی...... تقدیر کے لگائے ہوئے زخم بھر جائیں گے...... تب...... تب یہ باتیں کرنا...... میں یقین سے کہہ سکتا ہوں۔ تب وہ تمہاری باتیں قبول کر لے گی...... ذہنی اور دماغی طور پر لیکن ابھی نہیں...... ابھی اسے دھچکا بھی لگ سکتا ہے...... اور میں نہیں چاہتا کہ ایسا ہو......"

وہ چپ رہیں۔

نور احمد نے گردن گھما کر پھر انہیں دیکھا اور سنجیدگی سے بولے "یقیناً تم بھی ایسا نہیں چاہو گی......"

انہوں نے سر اثبات میں ہلایا......

گاڑی گھر کے گیٹ میں داخل ہونے لگی تو چوکیدار نے سلام کر کے گیٹ کے دونوں پٹ کھول دیے۔

بارش ہو جانے سے فضا میں پھیلتی تپش بہت کم ہو گئی تھی۔ ایک دم موسم بے انتہا خوبصورت اور ٹھنڈا ہو گیا۔ آسمان پر اب بھی بادل تیرتے پھر رہے تھے۔ ہوائیں چل رہی تھیں اور ہلکی ہلکی پھوار سے بھیگی بھیگی سی تھیں۔

پانچ بج چکے تھے۔ نورینہ تیار ہو کر کمرے سے نکلی۔ ممی لابی میں ہی تھیں۔ نورینہ نے ہلکے کاسنی رنگ پر ہلکی گلابی پرنٹ کے کپڑے پہن رکھے تھے۔ پنک دوپٹہ کندھوں پر تھا۔ اس کے چہرے کی شگفتگی کے سامنے دوپٹے کا رنگ ماند ماند لگتا تھا۔

ممی نے نورینہ کو نظر بھر کر دیکھا۔ چوبیس برس کی تھی لیکن معصوم لگتی تھی۔ چہرے پر نور سا پھیلا تھا۔ وہ واقعی ننھی منی خوشیاں چُن رہی تھی...... دامن بھر رہی تھی اور ان کی مہک اپنے اندر اتار رہی تھی۔

"ممی۔" نورینہ نے کہا۔

"کہیں جا رہی ہو؟"

"ہاں۔"

"کہاں؟"

"ہاسپٹل۔"

وہ چپ ہو گئیں۔ نورینہ بولی۔ "ممی ایک کپ چائے تو پلوا دیں۔"

"چائے آ رہی ہے۔ بیٹھو......"

"مَیں جلدی میں ہوں ممی۔ پانچ بج چکے ہیں۔"

"اتنی جلدی بھی کیا......

"مَیں نے ابھی پھول لینے ہیں۔ پھر ہوسپٹل جانا ہے۔ اس کے بعد دو لڑکیوں کو ملنا ہے......"

"کون ہیں یہ دو لڑکیاں؟"

"بڑی غریب۔ محنتی اور ٹانگوں سے معذور......"

"دونوں؟"

"ہاں۔"

"توبہ خدایا۔"

"ممی...... کبھی آپ بھی میرے ساتھ چلا کریں نا۔ آپ کو پتہ چلے کہ دنیا میں کتنے دکھی لوگ ہیں۔ کتنے کرب سے دوچار ہیں۔ کتنے مظلوم ہیں اور کتنے جرأت مند اور بہادر ہیں کہ ایسے حالات میں بھی زندگی کا مقابلہ کر رہے ہیں، جی رہے ہیں......"

ملازم چائے لے آیا۔ ممی نے ٹرالی اپنے سامنے کر لی۔ نورینہ کے لیے چائے بنائی۔ اس نے کھڑے کھڑے پیالی پی......

"ساتھ کچھ لے لو۔"

"شکریہ ممی۔ چائے ہی کافی ہے۔"

وہ بیگ اٹھا کر جانے لگی تو ممی نے ہنستے ہنستے پوچھا۔ "بینک بیلنس ختم ہوا کہ نہیں......"

"اوہ ممی......" نورینہ مسکرائی۔ "کوئی بات نہیں، ختم ہو گیا تو آپ کے اکاؤنٹ سے اُڑایا کروں گی......"

"بیٹے حساب سے ہی خرچ کیا کرو۔"

نورینہ نے ماں کی طرف گہری نظروں سے دیکھا۔ ان نظروں میں شکوہ بھی تھا۔ ہنس کر بولی۔ "جن کے پاس بے حساب ہو، انہیں حساب نہیں کرنا چاہیے۔ خدا دے رہا تو ان لوگوں کا حصہ بھی دیں۔ فکر نہ کریں۔ میرے اکاؤنٹ میں ابھی اتنا پیسہ ہے کہ ان کاموں کو عمر بھر کر سکتی ہوں......"

ممی چُپ ہو گئیں۔
نورینہ ان کے صوفے پر جھک کر ان کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولی۔

"ممی......"

"ہوں۔"

"نوید اور سعید کا امریکہ کا پروگرام بن رہا ہے؟"

"ہاں......"

"سیر کا؟"

"ہاں تو اور۔"

"شاید آپ بھی جائیں؟"

"ہوں۔"

"کتنا روپیہ خرچ ہو گا؟"

"جتنا بھی ہو گا......"

"بے اندازہ...... بے شمار......"

"ہاں ہو گا۔ آخر کماتے کس لیے ہیں؟"

"یہ بھاری بھر کم خرچ کرتے وقت تھوڑا سا ان لوگوں کا بھی سوچا کیجیے جن کے پاس پھوٹی کوڑی بھی نہیں ہوتی اور جو وقت اور زمانے کے مظالم کا شکار ہوتے ہیں۔ فائیو پرسنٹ بھی ان لوگوں کے لیے نکال لیا کریں تو بہت کچھ ہو سکتا ہے......"

"تم کس کس کا بیڑا اُٹھاؤ گی؟ دنیا بھری ہوئی ہے ایسے لوگوں سے۔"

"چند ایک کا بھی اُٹھا لوں...... تو دکھوں کے مارے لوگوں میں چند لوگوں کی کمی تو ہو جائے گی...... ایک فیملی کی بھی ہیلپ کر دوں تو......"

"اچھا بابا جو مرضی ہے کرو......"

"سویٹ ممی۔"

نورینہ نے ماں کو پیار کیا اور لابی سے نکل گئی۔
ہاسپٹل سے واپسی پر وہ ان معذور لڑکیوں سے ملنے گئی۔ انہیں کچھ پیسے

دیے۔ ان کی بنائی ہوئی چیزیں دیکھیں اور انہیں اور کام دلانے کا وعدہ کر کے باہر نکل آئی۔

وہ کسی دکاندار سے سلائی، کڑھائی کا کام کروانے کی بات کرنا چاہتی تھیں۔ دونوں بہنیں مزدوری کر کے پیٹ پال سکتی تھیں۔ ان کے لیے مشکل یہ تھی کہ خود جا کر کام نہ لا سکتی تھیں...... دونوں کی ٹانگیں مفلوج تھیں۔

وہ بازار کی طرف آ گئی۔

گنجان آباد بازار سے گزر رہی تھی کہ سڑک کے کنارے کنارے چلتا اسے جاوید نظر آ گیا۔

اس کے برابر جا کر اس نے گاڑی ہلکی کی۔

جاوید دھیان دیے بغیر اپنی سوچوں میں ڈوبا چلتا گیا۔

نورینہ کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس نے دو تین بار ہارن دیا۔ جاوید نے پلٹ کر دیکھا۔

"ہیلو۔" نورینہ مسکرائی۔

جاوید نے آزردہ نگاہیں اس پر ڈالیں...... وہ مضطرب سی ہوئی......
کھڑکی سے سر نکال کر پوچھا۔ "کیا حال ہے جاوید صاحب؟"

جاوید کچھ نہیں بولا۔

"آئیے...... میں آپ کو ڈراپ کر دوں گی۔"

جاوید جلدی سے بولا۔ "شکریہ، میں پیدل چلا جاؤں گا۔"

"تکلف نہ کیجئے...... میں ادھر جا ہی رہی ہوں۔"

اس نے اصرار سے جاوید کو گاڑی میں بٹھا لیا۔ گاڑی دوڑنے لگی۔

"کیا بات ہے، آپ پریشان ہیں کیا؟" اس نے جاوید کے سراپا پر نگاہ ڈالی۔

اور

پھر

جیسے ایک دم یاد آ گیا...... جلدی سے بولی۔ "آپ کی بیٹی کیسی ہے اب؟"

جاوید کے کلیجے میں جیسے تیر کی انی چُبھ گئی...... بے حد مضطرب نظر آیا۔ پھر گہری سانس لی...... اور بولا...... "جیسی تھی۔"

نورینہ نے سر گھما کر اسے غور سے دیکھا۔ "آپ اسی کی وجہ سے پریشان ہیں؟"

اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"بہت پیاری ہے نا آپ کو؟"

جاوید تڑپ گیا۔ نچلا ہونٹ دانتوں تلے دبا لیا...... کچھ نہ کہہ سکا۔

نورینہ بولی۔ "کیا ہوا ہے اسے، ڈاکٹر کو نہیں دکھایا......"

جاوید نے پریشان ہو کر اسے دیکھا۔ "آپ کو نہیں معلوم......؟"

"کیا؟"

"میری بچی کے متعلق؟"

"نہیں تو......"

"ہوں۔"

جاوید نے ایک دکھی سانس کھینچی۔ اتنا بڑا حادثہ تھا۔ نور احمد کو معلوم تھا۔ انہوں نے نورینہ کو بتایا تک نہیں تھا۔ یونہی بات کر دی ہوتی......

وہ دُکھی ہو گیا۔

نورینہ حیرانگی سے اسے تکتے ہوئے بولی۔ "کیا ہوا ہے اسے؟"

"جل گئی تھی۔" وہ کراہا۔

"کب؟"

"شب برات پر......"

"اوہ...... اتنے ڈھیر سارے دن ہو گئے۔ میرے شکاگو جانے سے بھی پہلے کی بات ہے؟"

"ہاں۔"

"مجھے کسی نے بتایا ہی نہیں۔"

"اتنی اہم بات نہیں تھی کسی کے لیے......"

"پھر بھی...... کسی نے ذکر تو کیا ہوتا۔"

وہ پھر اک آہ سرد کھینچ کر رہ گیا۔

نورینہ بولی۔ "ہوسپٹل میں ایڈمٹ نہیں کیا تھا؟"

"تین ماہ وہاں رہی ہے۔"

"اوہ...... زیادہ ہی جل گئی تھی؟"

اس نے سر ہلا دیا۔

"بڑا افسوس ہوا سن کر۔"

"مہربانی۔"

جاوید نے جس انداز میں کہا نورینہ کا دل مچل گیا...... وہ کچھ سوچنے لگی۔
گاڑی بازار میں آئی تو جاوید بولا۔ "مجھے یہاں ہی ڈراپ کر دیں۔"

"کیوں؟"

"میں نے کچھ چیزیں خریدنا ہیں۔"

"خرید لیں۔"

"آپ جائیں۔ بہت بہت شکریہ۔"

وہ گاڑی رُکنے پر اُتر گیا۔

نورینہ اسے چند لمحے تکتی رہی۔ پھر گاڑی چلا کر بازار سے نکل گئی......

"بے بی۔"

"ابھی ابھی سوئی ہے۔"

"اس کے کھلونے لایا ہوں۔"

"مت جگائیے گا۔ بڑی مشکل سے تو اس کی آنکھ لگی ہے۔"

جاوید نے فاخرہ کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھیں بھیگی ہوئی تھیں۔ پوچھنے کی تو کوئی بات ہی نہ تھی۔ خود ہی سمجھ گیا کہ ماں بچی کی اذیت پر تڑپی ہو گی۔

صحن میں چارپائیاں بچھی تھیں...... ایک طرف جاوید کی دوسری طرف فاخرہ کی۔

درمیانی چارپائی پر بے بی سو رہی تھی جس کے زخم تقریباً مندمل ہو گئے تھے لیکن جسم کی تکلیف رفع نہ ہوئی تھی۔ ہاتھ، پاؤں یا جسم کی خفیف سی حرکت پر کراہ اٹھتی...... اور کبھی ذرا سا ہاتھ پاؤں دباؤ کھا جاتا تو گھنٹوں تڑپ ہی ختم نہ ہوتی تھی۔

جاوید نے پلاسٹک کے کھلونوں والا لفافہ فاخرہ کو تھما دیا۔

اس نے لفافہ بے بی کے سرہانے رکھتے ہوئے آہستگی سے کہا۔ "کھانا لاؤں؟"

"نہیں۔"

"کیوں؟"

"بھوک نہیں ہے۔"

"تھوڑا سا کھا لیں۔"

"تم نے کھایا؟"

"نہیں۔"

"چلو لاؤ، زہر مار کر ہی لیں۔"

فاخرہ ایک پلیٹ میں سالن اور دوسری میں دو روٹیاں رکھ لائی۔ پرانی سی میز پر اس نے کھانا رکھ دیا۔

جاوید ہاتھ دھو کر آ گیا۔ کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ "تم تو کھا لیا کرو۔"

"میرے تو حلق میں پھنس جاتی ہے روٹی۔"

"فاخرہ جانی...... ایسے......"

"پھر کیا کروں۔" وہ رو دی۔

جاوید کا ہاتھ لقمہ توڑتے توڑتے رہ گیا۔

فاخرہ نے دوپٹے کے پلّو سے آنسو پونچھے اور گلوگیر آواز میں بولی۔ "بے بی کے علاج کا کچھ نہیں ہو سکتا......"

جاوید سر تھام کر بیٹھا رہا۔

"تڑپ تڑپ کر مر جائے گی۔" فاخرہ بولی۔

جاوید کا جی پھٹ جانے کو تھا۔ بے ساختہ جی چاہا کہے "مر جائے...... مر جائے۔"

لیکن

وہ کچھ بھی نہ کہہ سکا۔

"جاوید۔"

"ہوں۔"

"ہمیں کچھ نہ کچھ کرنا ہے۔ بے بی کا علاج ہونا چاہیے۔ اس کے لیے ہمیں بھیک مانگنا پڑے...... تو بھی......"

وہ اس کی سادگی پر مسکرا دیا۔ بہت زخمی مسکراہٹ تھی یہ......

"شہر امیر کبیر لوگوں سے بھرا پڑا ہے......"

"پاگلوں کی سی باتیں کرتی ہو...... باہر لے جانے اور علاج کرانے کے لیے لاکھوں کی ضرورت ہے۔ لاکھوں کی...... بھیک اتنی مل سکتی ہے تو سب سے پہلے میں کشکول اٹھاتا...... فاخرہ...... میں...... میں......"

"پھر......"

"پھر میں کیا بتاؤں۔"

"ایسے کیسے گزرے گی...... بے بی کی اذیت دیکھی نہیں جاتی۔ میں آج پھر ڈاکٹر سے پوچھنے گئی تھی۔ وہ کہتے ہیں ٹنڈن سکڑ گئے ہیں جس کی وجہ سے یہ تکلیف ہوتی ہے اور ان کا علاج آپریشن کے سوا کچھ نہیں...... آپریشن باہر ہی ہو سکے گا...... وہاں سرجری......"

"اوہ خدایا...... بس بھی کرو۔ جو بات ممکن ہی نہیں، اس کے متعلق سوچتی کیوں ہو......"

فاخرہ بے بس ہو کر رونے لگی...... سسکیوں کے درمیان بار بار یہی کہے گئی...... "کوئی میری جان لے لے...... پر میری بچی کا علاج کروا دے......"

جاوید دل جلانے والے تمسخر سے ہنسا۔ خود بھی تو جل رہا تھا۔ دونوں نے کھانا نہیں کھایا۔ دو نوالے بھی بمشکل حلق سے اترے۔ جاوید ہاتھ دھو کر اندر چلا گیا...... چند لمحوں بعد کپڑے بدل کر آ گیا۔

فاخرہ اب بھی آنسو بہا رہی تھی۔

وہ بستر پر آ کر لیٹ گیا اور ڈھلے ہوئے آسمان پر چمکتے تاروں کو دیکھنے لگا۔ کہیں کہیں بادل بھی تیرتے پھر رہے تھے۔ بادلوں کے یہ ٹکڑے کبھی کسی شکل اور کبھی کسی شکل میں ڈھل جاتے۔

فاخرہ برتن سمیٹ کر کچن میں رکھ آئی۔ پھر اپنے بستر میں لیٹ گئی۔ شاید اس کی آنکھ بھی لگ گئی۔

لیکن

جاوید کی آنکھیں کھلی تھیں اور وہ ستاروں کی بادلوں سے آنکھ مچولی دیکھتے

ہوئے سوچوں میں گم تھا۔

بادلوں کے ٹکڑے مختلف شکلوں میں ڈھل رہے تھے۔ کبھی واضح شکل بن جاتی جو پھیلتے پھیلتے کوئی اور روپ دھار لیتی۔

بادلوں کے گالے آسمان پر تیر رہے تھے۔ اچانک اک گالا کچھ اس طرح پھیلا کہ کار کی واضح شکل نظر آنے لگی۔

کار

اور پھر

کار کے حوالے سے اسے نورینہ کا خیال آ گیا۔

اور

اور

پھر

اچانک ہی اس کے ذہن میں اک خیال بجلی کے کوندے کی طرح لپکا۔

اس خیال سے وہ خود ہی گھبرا بھی گیا۔ بستر سے اٹھ بیٹھا اور دونوں ہاتھوں پر سر گرا لیا۔

لیکن

خیال ذہن میں لپک جھپک کر آتا ہی گیا۔

وہ نڈھال ہو کر بستر میں گر گیا لیکن اس خیال نے اس کا پیچھا نہ چھوڑا۔ اس نے کروٹ پہ کروٹ بدلی۔ آنکھیں میچ میچ کر بند کیں۔ بستر میں اٹھ بیٹھا۔ صحن میں ٹہلتا رہا۔

لیکن

خیال ذہن سے اس طرح چپک گیا جس طرح جلی ہوئی نائیلون کا فراک بے بی کے پگھلتے گوشت میں چپک گیا تھا۔

وہ سوچتا رہا۔

سوچتا رہا۔

اور خیال مستحکم اور مضبوط ہوتا گیا۔

اس نے فاخرہ کی طرف دیکھا۔ جو نڈھال پڑی تھی جس کے چہرے پر دنیا جہان کی مایوسیوں کا تسلط تھا۔

جاوید کے کانوں میں اس کے دکھ و اذیت سے بھرے الفاظ اترنے لگے۔ "کوئی میری جان لے لے لیکن میری بچی کا علاج کرا دے۔"

خود اس کی اپنی آواز اس کے کانوں میں گونج بن گئی۔

"بے بی کے لیے میری جان حاضر ہے۔ جان بھی حاضر ہے۔ کوئی میری جان لے کر بھی اس کا علاج کرا دے۔ پہلی سی بے بی بنا دے۔ اس کی معذوری ختم کر دے۔ اس کی تکلیفیں رفع کر دے...... تو میں بخوبی سب کچھ کر سکتا ہوں۔"

وہ اس گونج سے

اس گونج کی تکرار سے گھبرا گیا۔

اس نے پھر فاخرہ کو دیکھا۔ اس کے ذہن میں آیا ہوا خیال فاخرہ پر بجلی بن کر بھی گر سکتا تھا۔

لیکن

اس نے بے بی کو دیکھا جس کے چہرے پر گہری نیند میں بھی اذیت کے آثار تھے اور زخمی عضو ذرا سا ہل جانے کی وجہ سے یہ اذیت چیخ بنا چاہتی تھی۔

اچانک بے بی چیخ اٹھی۔

فاخرہ بڑبڑا کر بولی۔ "جان...... میری جان......"

آنکھیں ملتے ہوئے وہ بچی کے بستر پر بیٹھ گئی۔ جاوید بھی اس پر جھک گیا۔

بے بی گہری نیند میں تھی لیکن اذیت سے تڑپ رہی تھی۔ فاخرہ اسے پیار کرتے ہوئے اس کے ہاتھ اور پاؤں آہستہ آہستہ سہلانے لگی۔ بچی کی تکلیف ناقابلِ برداشت تھی۔

جاوید نے کانوں میں انگلیاں دے کر آنکھیں بند کر لیں۔

اس کے ذہن میں وہی خیال لہرا گیا۔

اس نے آنکھیں کھول کر بے بی کو دیکھا۔

اس کا جی چاہا۔ زور زور سے چیخے اور اعلان کر دے کہ "بے بی میں تمہاری خاطر اس مرحلے سے بھی گزر جاؤں گا۔ میں تمہارا علاج کرواؤں گا۔ تمہارے علاج کے لیے پیسہ حاصل کروں گا...... کوئی بات نہیں۔ اس کے لیے مجھے کتنی بڑی قربانی دینا پڑے۔ فاخرہ کو بھی قربانی دینا پڑے...... لیکن...... لیکن میں ایسا ضرور کروں گا...... ضرور کروں گا......"

بے بی کئی منٹ روتی چیختی رہی۔ پھر سسکنے لگی۔ پھر سسکیاں بھی مدھم ہو گئیں......

وہ نیند کی آغوش میں پہنچ گئی تھی۔

فاخرہ اپنے بستر پر آ گئی۔ جاوید کی طرف دیکھا اور دکھے لہجے میں بولی۔

"آپ اب تک جاگ رہے ہیں۔ سو جائیے نا......"

وہ کچھ کہے بغیر بستر میں لیٹ گیا۔

لیکن

نیند آنکھوں سے دور رہی......

وہ اپنے خیال کو عملی جامہ پہنانے کا سوچنے لگا......

خیال

جو بے بی کو حیات تو بخش سکتا تھا۔

لیکن

جو

جو

"خیر......" اس نے سر جھٹک دیا۔ "ہم دونوں کو قربانی دینا ہو گی۔"

رات آدھی سے زیادہ گزر گئی تھی...... وہ بے دم ہو کر لیٹ گیا۔ پھر نیند اس پر مہربان ہو گئی۔

دروازہ کسی نے آہستہ سے تھپتھپایا۔

"کون؟" فاخرہ نے کچن سے آواز دی۔ وہ ناشتے کے برتن دھو رہی تھی۔

جاوید دفتر کچھ لیٹ ہی گیا تھا۔ اس کے جانے کے بعد اس نے بے بی کا بستر بدلا تھا۔ اسے صاف ستھرا کر کے ایک طرف کھلا کرتا جو ٹانگیں بھی ڈھانپ لیتا تھا، پہنا دیا تھا۔ اس کے بستر میں بھی پاؤڈر چھڑکا تھا اور نرم ململ کی دو گدیاں بنا کر بے بی کے کولہے، کندھے، بازو اور ٹانگ کے نیچے رکھ دی تھیں۔ اس طرح معمولی سی حرکت سے اسے تکلیف تو ہوتی تھی لیکن قدرے کم۔

اب بے بی میں بھی کچھ برداشت کا مادہ پیدا ہو گیا تھا۔ سی کی سی آواز منہ سے ضرور نکلتی...... ویسے بھی وہ حتی الامکان کوئی عضو نہ ہلاتی تھی جب ہل جاتا تو خدا کی پناہ۔

کمرے کی جھاڑ پونچھ کر کے وہ بے بی کے سامنے پلاسٹک کے دونوں کھلونے رکھ آئی تھی جنہیں بے بی اپنے بائیں ہاتھ سے کبھی کبھی چھو لیتی تھی۔

اب فاخرہ نے برتن دھو کر کچن صاف کرنا تھا۔

دروازے پر پھر دستک ہوئی۔

وہ نل کے نیچے ہاتھ دھو کر پلو سے پونچھتے ہوئے جلدی سے ڈیوڑھی میں آئی۔ دروازے کی درز سے آنکھ لگا کر دیکھا۔

کسی سمارٹ سی خاتون کو دیکھ کر وہ حیران بھی ہوئی...... دروازہ کھول دیا۔

آنے والی نے اسے سلام کیا اور مسکرا کر بولی۔ "یہ جاوید صاحب کا گھر ہے؟"

"جی ہاں۔" وہ حیرانگی سے لڑکی کو تکنے لگی۔

"میں اندر آ سکتی ہوں؟" خاتون نے سیاہ چشمہ اتار کر ہاتھ میں پکڑتے ہوئے فاخرہ کو دیکھا۔ فاخرہ نے اندر آنے کے لیے ایک طرف ہٹ کر راہ بنا دی۔

"آپ مسز جاوید ہیں؟" وہ بولی۔

"جی۔"

"آپ کی بچی جل گئی تھی؟"

فاخرہ نے دروازہ بند کر کے کنڈی چڑھاتے ہوئے آہ بھری۔ "جی۔"

"اب کیسی ہے وہ؟"

"زندہ ہے نہ مردہ۔" فاخرہ کی آواز رندھ گئی۔ خاتون نے پلین زرد ساڑھی کا ڈھلکتا پلو سینے پر پھیلاتے ہوئے اس کی طرف دیکھا۔ فاخرہ کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

"کیا وہ بہت جل گئی ہے؟" اس نے پوچھا۔

وہ اس کو اندر لے آئی۔ خاتون نے چھوٹے سے صحن کو عبور کرتے ہوئے گھر کا جائزہ لیا۔ خستہ حالی عیاں تھی۔ فاخرہ کا لباس صاف تھا لیکن معمولی ململ کا تھا۔

کمرے میں داخل ہو کر بھی خاتون نے چاروں طرف دیکھا۔ دو پرانی وضع کے پلنگ تھے۔ ایک طرف دو کرسیاں تھیں۔ کونے میں میز دیوار پر دو تصویریں، یہی کُل کائنات تھی۔

فاخرہ نے کرسی پلنگ کے قریب کر دی۔ خاتون نے فاخرہ کی طرف دیکھا۔ وہ عام نقش و نگار کی عورت تھی...... جس کی رنگت دھندلائی ہوئی تھی۔ بیمار لگ رہی تھی۔

فاخرہ نے پنکھا تیز کر دیا......

"کون ہے امی؟" بے بی نے گردن موڑے بغیر پوچھا۔

"میں ہوں بیٹے۔" فاخرہ کی جگہ اس نے کہا۔

پھر

فاخرہ نے ململ کا دوپٹہ بچی پر سے ہٹا دیا۔ پہلی نظر جو بچی پر پڑی تو خاتون نے بے اختیارانہ ہاتھ اپنی آنکھوں پر رکھ لیا۔

بے بی نے سمارٹ سی عورت کو دیکھا تو بولی۔ ''سلام آنٹی۔'' لباس اور وضع قطع سے ذہین بچی نے یہی سمجھا کہ یہ عورت خالہ نہیں کہلا سکتی۔ اسے آنٹی کہنا چاہیے......

چند لمحے خاتون کو نارمل ہوتے لگے۔ پھر وہ پلنگ پر جھک گئی۔

فاخرہ نے جلدی سے بتایا۔ ''اسے ہلائیے گا نہیں۔ ذرا سی حرکت پر بھی تڑپ جاتی ہے۔''

''اوہو۔''

اس نے بچی کو دیکھا، آدھا چہرہ بتاتا تھا کہ وہ کبھی پھول سی ہو گی لیکن اب......! وہ بچی کے جلنے کی تفصیلات پوچھنے لگی۔ علاج کے بارے میں پوچھا۔

فاخرہ جانے کس جذبے کے تحت رو کر بولی۔ ''اس کا علاج ہو سکتا ہے...... لیکن......''

''لیکن کیا؟''

''آپ سے کیا کہوں...... میں آپ کو جانتی بھی نہیں۔ آپ کیا کر سکتی ہیں؟'' فاخرہ بولی۔

''مَیں ایک سوشل ورکر ہوں۔ مجھے تفصیل سے سب کچھ بتائیے۔ ہو سکتا ہے، میں آپ کی کوئی مدد کر سکوں۔''

''آپ کو پتہ کیسے چلا بچی کا؟''

وہ چند لمحے چپ رہی، پھر بولی۔ ''ہوسپٹل سے۔''

''اچھا۔''

''ہوں۔''

''براہِ مہربانی آپ مجھے سب کچھ بتائیے...... ڈاکٹری رپورٹیں کہاں ہیں......''

فاخرہ کو تو جیسے امید کا دمکتا چہرہ نظر آ گیا۔ بھاگ کر دوسرے کمرے میں گئی اور فائل اٹھا لائی۔ پھر ڈاکٹروں کی رائے اور علاج کے متعلق بتانے لگی۔

''میں آپ کا احسان تاعمر بُھلا نہ پاؤں گی۔ آپ سوشل ورکر ہیں، میری بچی کے

لیے کچھ کیجیے...... ہم غریب ہیں۔ اتنے بڑے خرچ کے متحمل نہیں ہو سکتے لیکن اس بچی کو اس طرح دیکھ بھی نہیں سکتے......''

وہ آنچل سے آنسو پونچھنے لگی۔ اس کا بس چلتا تو خاتون کے قدموں پر سر رکھ کر بھیک مانگتی۔

خاتون سب کچھ سنتی رہی۔

پھر بولی۔ ''میں ڈاکٹر سے آج ہی ملوں گی...... پوری بات انہی سے ہو سکتی ہے۔''

''سب یہی کہتے ہیں کہ باہر جا کر آپریشن ہو اور پھر پلاسٹک سرجری تو بچی بالکل ویسی ہی ہو جائے گی۔''

''ہوں۔''

''مجھ سے زیادہ اس کے ابو پریشان ہیں۔ مجھے تو ڈر لگتا ہے ان کے دماغ کو کچھ نہ ہو جائے۔ بچی سے انہیں شدید محبت ہے لیکن وہ بیچارے بھی کیا کریں...... کچھ کر بھی نہیں سکتے......''

وہ دھاروں دھار رونے لگی۔

بے بی خاموش پڑی تھی۔ خاتون اس سے باتیں کرنے لگی۔ بہت اچھی بڑی تمیز دار بچی تھی۔

فاخرہ اٹھ کر گئی۔ اسے خاتون کو کوک پیش کرنے کا خیال آ گیا۔ گلی میں بچے کھیل رہے تھے۔ اس نے منی کو بلایا۔ پیسے دیئے اور ٹھنڈی کوک لانے کو کہا۔

کوک اس نے خاتون کو پیش کی تو اس نے سر ہلا کر انکار کیا۔

''نہیں آپ پئیں جی......'' فاخرہ نے اصرار کیا۔ خاتون نے گلاس میں ڈال کر آدھی کوک لے لی...... باقی بے بی کو دینے کے لیے کہا۔

وہ تھوڑی دیر اور بیٹھی۔ پھر اپنی نوٹ بک نکالی۔ بے بی کا نام، عمر اور دوسری باتیں نوٹ کیں۔ جاوید کا نام و پتہ بھی لکھا۔

اور

فائل ہاتھ میں لیتے ہوئے بولی۔ ''میں یہ فائل ساتھ لے جا سکتی ہوں......؟''

''جی......''

''ڈاکٹروں سے مشورہ کروں گی۔''

''لے جائیے۔''

''آپ کو واپس کر دوں گی۔ بہر حال میں پوری کوشش کروں گی کہ بچی کا علاج ہو جائے۔''

فاخرہ نے اس کے سامنے ہاتھ باندھ دیئے۔ خاتون نے اس کے ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر اسے تسلی دی۔

جانے سے پہلے فاخرہ نے پوچھا۔ ''آپ کا نام کیا ہے؟''

وہ مسکرائی اور بولی۔ ''ایک سوشل ورکر۔ سماجی کارکن...... خدا کرے آپ کی بچی کے علاج کے لیے میرے ہاتھوں کچھ ہو جائے۔''

''آمین...... خدا آپ کو خوش رکھے۔ خدا آپ کو زندگی دے۔''

وہ

بچی اور فاخرہ کو خدا حافظ کہہ کر کمرے سے نکل گئی۔

فاخرہ اسے ڈیوڑھی تک چھوڑنے آئی۔

جاوید دفتر سے آیا تو فاخرہ نے پہلی بات ہی سوشل ورکر کی بتائی۔

جاوید کا دھیان فوراً جمیل، ارشد اور ہمایوں کی ان باتوں کی طرف گیا۔ وہ آج کینٹین میں بیٹھے کسی سوشل ورکر کی باتیں کر رہے تھے۔ جاوید کے ہاں جانے پر چپ ہو گئے تھے۔ جمیل نے صرف یہ کہا تھا کہ وہ بے بی کے علاج کے لیے کسی سوشل ورکر سے بات کر رہے ہیں......

بے بی سے دو چار باتیں کرنے کے بعد جاوید کپڑے تبدیل کرنے لگا۔ فاخرہ چائے کی پیالی لے آئی۔

وہ کرسی پر بیٹھ کر چائے پینے لگا۔ فاخرہ پھر بے بی کے علاج کی باتیں کرنے

لگی۔ اس خاتون کی ایک ایک بات اس نے دہرائی۔ جاوید نے ناممکن کو ممکن نہ سمجھا۔ کچھ سوچتا رہا۔ پھر فاخرہ کی طرف دیکھا اور ایک دم بولا۔ ''فاخرہ بے بی کا علاج ممکن ہے۔''

''کیسے......؟'' وہ ایک دم بولی۔

جاوید چند لمحے چپ رہا۔ پھر بولا۔ ''فاخرہ کچھ پانے کے لیے کچھ دینا بھی پڑتا ہے۔''

وہ جذباتی لہجے میں بولی۔ ''میں اپنا سب کچھ دینے کو تیار ہوں۔ خدا کے لیے بچی کے لیے کچھ کیجیے۔''

''ٹھیک ہے...... ہر قربانی کے لیے تیار رہنا ہو گا۔''

''میں تیار ہوں۔''

جاوید نے پیالی واپس رکھ دی اور سوچوں میں گم ہو گیا۔ وہ مطمئن تھا اور بے حد اداس۔

''ہیلو''

''مس نورینہ احمد ہیں؟''

''ہولڈ کیجیے، میں دیکھتا ہوں۔ شاید ابھی وہ باہر سے آئی ہیں۔ ہاں آپ کا نام؟''

''جاوید......''

ملازم نے فون سٹینڈ پر چونگا لٹکایا اور نورینہ کے کمرے کی طرف گیا۔ وہ کمرے میں داخل ہی ہوئی تھی۔ ہاتھ میں کچھ لفافے، کچھ کاغذات اور بیگ تھا جنہیں میز پر رکھ رہی تھی۔

''بی بی......'' ملازم نے دروازے سے باہر کھڑے ہو کر کہا۔

''ہوں'' وہ بولی۔

''آپ کا فون ہے جی۔''

''اچھا۔''

''کوئی جاوید صاحب ہیں۔''

''جاوید'' نورینہ کے ہاتھ سے لفافہ چھوٹ گیا۔ اس نے ملازم کی طرف یوں دیکھا جیسے اس نے غلطی سے یہ نام بتا دیا ہو۔

''جی بی بی......'' وہ بولا۔

نورینہ چیزیں وہیں چھوڑ کر باہر آئی...... فون لابی میں رکھا رہتا تھا۔ تیز قدموں سے چلتے وہ فون تک پہنچی۔

''ہیلو'' اس نے فون اٹھایا۔ ''نورینہ بول رہی ہوں۔''

''جاوید'' وہ بولا۔

''جی فرمائیے۔''

''مس نورینہ''

''ہوں۔''

وہ ایک دم کچھ نہ کہہ سکا۔ خاموشی پر نورینہ کو دو تین بار ہیلو ہیلو کہنا پڑا......

''مس نورینہ''

''جی''

''آپ......''

''آپ کچھ کہنا چاہ رہے ہیں غالباً اور کہہ نہیں پاتے۔ کوئی خاص بات؟''

''مجھے...... مجھے آپ سے چند ضروری باتیں کرنا ہیں۔ کیا آپ مجھ سے مل سکتی ہیں......'' وہ سانس روکے بنا کہہ گیا۔ نورینہ نے اس کی گھبراہٹ محسوس کی۔

''میں گھر پہ ہی ہوں، آ جائیے۔''

''آپ نہیں آ سکتیں؟''

''مَیں...... مَیں کہاں آؤں؟''

''شیزان میں...... یا کسی اور ریسٹورنٹ میں۔''

وہ ہنسی۔ ''کیا چائے پلانے کا ارادہ ہے...... پارٹی دے رہے ہیں؟''

وہ گہری سانس لے کر بولا۔ ''نہیں...... صرف آپ سے ملنا ہے۔''

نورینہ نے چند لمحے کچھ سوچا۔ پھر بولی ''اچھا میں آ رہی ہوں۔''

''شیزان''

''وہیں سہی۔''

''میں آپ کا انتظار کروں گا۔''

نورینہ نے فون رکھ دیا۔ چند لمحے وہیں کھڑی رہی۔ اس کی آنکھوں میں بڑی گہری سوچ تھی۔

پھر

اس نے فون پر سے ہاتھ اٹھالیا۔ دونوں ہاتھ مسلتے ہوئے وہ کمرے میں آگئی۔

جاوید نے اسے بلایا تھااور جس انداز میں بلایا تھا، اس سے اندازہ کرنا مشکل نہ تھا کہ وہ کام کی نوعیت کچھ ہی کیوں نہ ہو، ہے ضروری اور خاص......

وہ یہی سوچ کر اداس ہو گئی۔

بعض صورتیں دل میں اتر جاتی ہیں۔ بعض دل سے اُتر جاتی ہیں۔ دل میں اترنے اور دل سے اترنے میں بظاہر اک لفظ کا ہیر پھیر ہے لیکن اس کا اثر...... اس کا دائرہ عمل، اس کا تسلط کتنا وسیع کتنا گھمبیر اور کیسا انوکھا ہے۔

جاوید کی صورت اس کے دل میں اتر گئی تھی۔ تو یہ بات نہیں رہی تھی کہ اسے وہ اسلم کے حوالے سے دیکھنے لگی۔ اس کی صورت دل میں اتری تو اسلم کی صورت دل سے اتر گئی۔ اس نے تو ڈھیروں صلاحیتیں اور خوبیاں جاوید میں پائی تھیں جو اسلم میں نہ تھیں۔ اسے تو یہی محسوس ہوتا تھا کہ اسلم وجود میں ہی صرف اسی لیے آیا تھا کہ اس کے حوالے سے وہ جاوید تک پہنچ سکے۔ اس کی شناخت اور اس کی پہچان کر سکے۔

وہ باتھ روم میں گئی۔ منہ ہاتھ دھویا۔ صبح سے وہ مختلف کاموں کے سلسلہ میں دفتروں، بینکوں کے چکر کاٹ رہی تھی۔

اس نے ہلکے زرد رنگ کی نیلے چھوٹے چھوٹے پھولوں والی ساڑھی پہنی۔ بالوں میں برش کیا۔ پرفیوم سپرے کی اور تازہ دم ہو کر باہر آگئی۔ اس کی ممی گھر پہ نہیں تھی۔ گاڑی میں بیٹھے ہوئے اس نے ملازم کو بتایا۔ "میں باہر جا رہی ہوں۔ ممی آئیں تو بتادینا......"

"بہت اچھا۔"

اس نے گاڑی نکالی اور سڑک پر آگئی۔

شیزان کے مین ڈور کے قریب ہی جاوید کھڑا تھا۔ اس کا چہرہ بالکل پھیکا اور تاثرات سے عاری تھا۔

نورینہ آئی تو وہ گاڑی کے قریب آگیا۔

سلام کے تبادلے کے بعد نورینہ نے گاڑی بند کی اور لاک کر کے باہر نکل آئی۔

اس کی آنکھوں پر سیاہ چشمہ تھا۔ چشمے کی اوٹ سے نورینہ نے جاوید کو غور سے دیکھا۔

دونوں چُپ چاپ اندر چلے گئے۔

تین ساڑھے تین کا عمل تھا۔ ابھی ہال تقریباً خالی تھا۔ کسی کسی میز پر دو دو ایک ایک عورتیں مرد بیٹھے تھے۔ کسی کے سامنے کوک تھی۔ کسی کے چائے، سرگوشیوں کے انداز میں باتیں ہو رہی تھیں۔

جاوید اور نورینہ ساتھ ساتھ چلتے اندر آئے تھے۔

"کیبن میں۔" جاوید نے اشارہ کیا۔

وہ مسکرائی۔ "کوئی بہت اہم بات ہے کیا؟"

"ہاں۔"

دونوں ایک طرف کی کیبن میں میز کے گرد بیٹھ گئے۔

بیرا انہیں دیکھتے ہی پوچھنے آگیا۔

"چائے؟" جاوید نے پوچھا۔

"منگالیں۔" وہ بولی۔ اس کے دل میں تو جو ہلچل تھی سو تھی۔ بظاہر بڑے اعتماد سے بیٹھی تھی۔

جاوید نے بیرے کو چائے کے ساتھ کچھ لوازمات لانے کو کہا۔ وہ چلا گیا تو اس نے نورینہ کی طرف دیکھا۔

نورینہ نے بھی اک بھرپور نگاہ اس پر ڈالی۔ اس کی بیچارگی اور مایوسی اس کی نگاہوں سے چھپی نہ رہی۔

"آپ نے مجھے خاص طور پر یہاں بلایا ہے۔"

"جی۔"

"کوئی خاص بات؟"

"ہاں۔"

"کہیے۔"

وہ ہچکچایا...... لیکن ہچکچاہٹ کی رکاوٹ ایک لمحہ میں عبور کر گیا۔ "مس نورینہ......"

"جی۔"

"میں نے ایک خاص بات کے لیے آپ کو زحمت دی ہے۔"

وہ ہمہ تن گوش تھی۔

"آپ نے اپنے منگیتر کا مجھ پر دھوکہ کھایا تھا......"

وہ چند لمحے چپ رہا...... نورینہ کا دل بے اختیارانہ دھڑکنے لگا۔ "جی......"

"اس کے بعد...... ہاں اس کے بعد......" وہ رک رک کر بولا۔ "شادی کی بات ہوئی تھی......"

"اور آپ نے انکار کر دیا تھا۔"

"اس وقت حالات اور تھے...... اب میں اس کے لیے تیار ہوں۔"

اس نے اتنا اچانک اور ایسا غیر متوقع کہا کہ نورینہ دھک سے رہ گئی۔ میز کے کنارے پر اس کی گرفت اتنی سخت ہو گئی کہ کنارہ انگلیوں میں چُبھ گیا۔ اس کی آنکھیں کھلی کی کھُلی رہ گئیں اور اس نے سپاٹ ویران نظریں جاوید کے چہرے پر جمادیں۔

کئی لمحے گزر گئے۔ جاوید نگاہیں نیچی کیے میز پر رکھی ایش ٹرے کو انگلیوں سے چکر دے رہا تھا۔

نورینہ نے صبر آزما کوشش کے بعد اپنے آپ کو سنبھالا۔ وہ بے شک نوعمر لڑکی نہیں تھی۔ چوبیس سال کی ہو رہی تھی۔ خود مختارانہ کام نے اس میں بلا کا اعتماد بھی بھر دیا تھا۔ خیالات کی رو رفاحی کاموں کی طرف موڑ کر بھی وہ اپنے میں اعتماد کی قوت بھر چکی تھی۔

لیکن

جذبات و احساسات کے نازک آبگینے تھے۔ انہی کی حفاظت کے لیے تو اس نے اتنی کاوش سے حصار اٹھایا تھا۔ سنبھال سنبھال کر رکھے تھے۔ خول میں لپیٹ لیا تھا۔

لیکن

جاوید کی بات سے حصار گر گیا۔ آبگینوں کو ٹھیس لگی اور خول میں دراڑیں پڑ گئیں۔ اس کا دل بھر آیا۔ آنکھوں کے گوشے بھیگ گئے لیکن اس نے انہیں آنکھوں ہی

میں پی لیا۔ بڑی نازک شے تھے۔ گرنے سے بچالیا۔

جاوید نے ایک گہری سانس لے کر سر اٹھایا۔

اس کے کچھ کہنے سے پہلے نورینہ چہرے پر لہولہان مسکراہٹ بکھرائے بولی۔

"بیوی اور بچی کی محبت اب مانع نہیں......"

اس نے اک طویل اور دکھ بھرا سانس لے کر کہا۔ "اس محبت کے ہاتھوں مجبور ہو کر میں یہ قدم اٹھانے پر مجبور ہوں مس نورینہ...... بخدا...... مجھے مایوس نہ کیجئے گا...... مجھے آپ کے ڈیڈی نے بزنس پارٹنر بنانے تک کی آفر دی تھی۔ دولت رتبہ سب کچھ دینے کو کہا تھا، مجھے کچھ نہیں چاہیے۔"

وہ حیرانگی سے جاوید کو دیکھنے لگی۔ اس کا رنگ ہولے ہولے اڑنے لگا۔ پھیلی پھیلی نگاہوں سے اسے تکنے لگی۔

"میں آپ کو کسی دھوکے میں نہیں رکھوں گا مس نورینہ۔ مجھے اپنی بیوی اور بچی سے شدید محبت ہے۔ میں اس محبت کو بیچنا چاہتا ہوں۔ آپ ضرورت مند ہیں۔ مجھ میں آپ کو اپنے منگیتر کی جھلک نظر آئی ہے۔ آپ کو اس سے تسکین ملتی ہے۔ آپ اپنے کھوئے ہوئے منگیتر کی شخصیت مجھ میں ڈھونڈ لیں گی...... میں...... میں آپ کو یقین دلاتا ہوں۔ آپ مجھ میں اس کی جو خوبی و صلاحیت دیکھنا چاہیں گی، میں اپنی شعوری کوشش سے یہ اپنے میں پیدا کر لوں گا......"

وہ چند لمحے چُپ رہی پھر سر جھکاتے ہوئے پرس کی ڈوری کو انگلی کے گرد لپیٹتے ہوئے اضطراب اور بے چینی کو چھپانے لگی۔

وہ سینے میں گھٹتی سانسوں سے بمشکل نبرد آزما ہوئے اسے تکنے لگا۔

نورینہ نے سر اٹھایا...... پھر پھیکی سی مسکراہٹ لبوں پر لاتے ہوئے بولی۔ "آپ نے میری ضرورت تو بیان کر دی۔ کیا میں آپ کی مجبوری جان سکتی ہوں کہ اپنی بیوی اور بچی کو شدت سے چاہتے ہوئے بھی......"

"مس نورینہ۔" اس نے عالم اضطراب میں کرسی پر ادھر سے اُدھر ہوتے ہوئے کہا۔ "ہم سب خود غرض ہیں۔ اپنی غرض کے سامنے جھکتے ہمیں کوئی عار محسوس

نہیں ہوتی۔ ہم دوسروں کے جذبوں کی پروا نہیں کرتے۔ ہم صرف اور صرف اپنے تک محدود ہوتے ہیں۔ اپنے دکھ، اپنے کرب، اپنی اذیت کو محسوس کرتے ہیں......"

"ہوں۔"

"میں بھی اک خود غرض انسان ہوں۔ میری غرض نہیں تھی تو میں نے آپ کی غرض کو سفاکانہ بیدردی سے ٹھکرا دیا تھا۔"

"پرانی باتیں جانے دیجئے۔" وہ لاپروائی سے بالوں کو سر کے جھٹکے سے پیچھے کرتی ہوئی بولی۔

"میں ضرورت مند ہوں مس نورینہ...... غرض مند ہوں۔ اس ضرورت اور غرض کے ہاتھوں مجبور ہو کر میں آپ تک پہنچنا چاہتا ہوں۔ میں نے پہلے بھی کہا ہے۔ میں آپ کو دھوکے میں نہیں رکھوں گا۔ میں فریب سے شادی بھی نہیں کروں گا۔ میں آپ کے سامنے اعتراف کرنے اور سچائی بیان کرنے میں باک نہیں...... میری بچی......"

اس کی آواز رندھ گئی۔ اس نے چند لمحوں کے لیے دونوں ہاتھوں پر سر گرا لیا۔ نورینہ کے سینے میں ہلچل مچ گئی۔ وہ اضطراب کے عالم میں کبھی مُٹھیاں کھولتی بند کرتی کبھی ہونٹ دانتوں تلے کاٹنے لگی۔

بیرہ چائے اور کچھ لوازمات لے آیا۔ اس نے چیزیں میز پر رکھ دیں۔ دونوں چپ چاپ بیٹھے رہے۔ بیرہ چلا گیا تو جاوید نے جیب سے رومال نکال کر اپنا ماتھا پونچھا۔ ایئر کنڈیشنڈ کیبن میں بھی اس کے ماتھے پر پسینے کی بوندیں تھیں۔ وہ آگ کے محرابوں تلے سے گزر رہا تھا۔ بیوی اور بچی سے دنیاوی بندھن کاٹ کر اس کی طرف بڑھ رہا تھا۔

نورینہ نے اس کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر سپیدی بکھر رہی تھی۔ ہونٹ خشک تھے اور آنکھوں میں کرب کی کیفیت تھی۔

جاوید چند لمحے چائے کے برتن دیکھتا رہا۔ پھر بولا۔ "چائے بناؤں؟"

"آپ اپنی بچی کے بارے میں کچھ کہہ رہے تھے۔" نورینہ نے اس کی بات اَن سُنی کر کے کہا۔

"ہاں...... میں نے آپ کو بتایا تھا، وہ جل گئی تھی۔" جاوید نے چائے بناتے ہوئے بچی کے جلنے، موجودہ صورتحال اور ڈاکٹروں کی رائے بتانے لگا۔

چائے کی پیالی اس نے سامنے بیٹھی نورینہ کے آگے رکھتے ہوئے مجرمانہ انداز میں سر جھکا کر کہا۔ "بچی کا علاج نہ ہوا...... تو...... تو کسی دن میں خودکشی کر لوں گا یا اسے قتل کر دوں گا۔"

"اوہ......" بے اختیارانہ اس کے لبوں سے نکلا۔

"ہاں مس نورینہ۔ میں اسے اس حال میں نہیں دیکھ سکتا۔ اس کی تکلیف ناقابلِ برداشت ہے۔ کاش وہ مر گئی ہوتی...... خود ہی مر جاتی......"

اس بات میں جو درد و کرب تھا۔ محسوس کر کے نورینہ کا دل دہل گیا۔

"آپ کے ڈیڈی نے مجھے بزنس پارٹنر کی آفر دی تھی۔ مجھے یہ کچھ بھی نہیں چاہیے۔ صرف، صرف اتنا چاہوں گا کہ آپ مجھ سے شادی کر لیں...... مجھے خرید لیں اور...... اور صرف اتنا کر دیں کہ میری بچی کے باہر لے جانے اور علاج کے لیے پیسہ دے دیں۔"

نورینہ کو دھچکا سا لگا۔ اس سے سانس بھی ٹھیک طرح سے نہ لی جا سکی۔ جاوید نے ہر بات کا پوری سچائی سے اس کے سامنے اعتراف کر لیا تھا۔

لیکن

لیکن

وہ اپنے جذبات اس پر کیونکر عیاں کر دیتی۔ اسے کیونکر بتاتی کہ اسلم کے حوالے سے تو وہ تم تک پہنچی ہے۔ تم جو اس کے من میں بس گئے ہو۔ تمہارے اور اسلم میں تو زمین آسمان کا فرق محسوس کرتی ہے۔ اسلم سے وہ وابستہ تھی لیکن تم سے تو وہ محبت کرتی ہے۔ تم نے ٹھکرا کر اس محبت کو اور مضبوط اور مستحکم کر دیا تھا۔ تمہارے مضبوط کردار کو دیکھ کر تو وہ محبت میں عقیدت کا رنگ بھی بھر چکی ہے۔ تم اس سے محبت نہیں کرتے۔ اب بھی اقرار کرتے ہو کہ بیوی اور بچی ہی تمہاری کائنات ہے۔ انہیں تم ٹوٹ کر چاہتے ہو...... تم صرف غرض مند ہو۔ ضرورت مند ہو۔ اس ضرورت

اور غرض کے بدلے میں اس کی ضرورت اور غرض پوری کرنا چاہتے ہو۔
کاش......
کاش تم جانتے کہ اس کی غرض اور ضرورت اک عظیم جذبے میں بدل چکی ہے۔ پیار اور محبت...... عشق...... جو بے لوث ہے، بے غرض ہے...... جو بدلہ نہیں چاہتا......

جو ہے
اور
نہیں ہے۔ اس کا وجود اس کی سچائی اس گہرائی و گہرائی سب کچھ ہے۔
لیکن
پھر بھی نہیں...... نہیں ہے۔
"چائے لیجیے۔" جاوید نے پیالی ذرا سی اور اس کی طرف سرکا دی۔
اس نے ایک سپ لی اور پیالی واپس رکھ دی۔
"مس نورینہ۔" جاوید نے پیالی چھوئے بغیر کہا۔
اس نے جاوید کی طرف دیکھا۔
"میری سچائی اور اعتراف آپ کو گراں تو نہیں گزرے؟"
اس نے نفی میں سر ہلا دیا...... بعض اوقات ہم کتنے منافق ہو جاتے ہیں...... جو کہنا ہوتا ہے، وہ نہیں کہتے۔ جو نہیں کہنا ہوتا، وہ کہہ دیتے ہیں۔
دونوں خاموشی سے چائے پینے لگے۔ پیسٹری یا کیک کا پیس کسی نے بھی نہیں اٹھایا...... نورینہ کی حالت کچھ غیر ہو رہی تھی۔ دل و دماغ میں جھگڑ چل رہے تھے۔ آنکھوں میں نزع کے سے عالم کی کیفیت تھی۔
جاوید اپنے مسائل ہی سے اُلجھا تھا۔ اس نے نورینہ کی بدلتی کیفیت پر غور ہی نہیں کیا......
چائے ختم ہو گئی۔ نورینہ نے آدھی پیالی ویسے ہی رکھ دی۔ جاوید نے اور چائے کے لیے نہیں پوچھا، نہ ہی کھانے کی چیز پیش کی۔ دونوں ذات کا کرب جھیل

رہے تھے۔ جاوید تو جذبات کے شکنجے پر چڑھا تھا۔ دہکتے انگارے اس شکنجے کو سینک رہے تھے۔ پھر بھی وہ نورینہ کا ہاتھ تھامنے کو تیار تھا۔
کئی لمحے خاموشی رہی۔
نورینہ نے پرس سے ٹیشو پیپر نکال کر چہرہ صاف کیا۔ پھر جاوید کی طرف دیکھا۔ ڈوبتی آواز اور انتہائی پھیکے لہجے میں بولی۔ "چلیں؟"
جاوید نے التجا آمیز دکھ کے ساتھ پوچھا۔ "میری گزارش؟"
"غور کروں گی۔" اس نے جلدی سے کہا۔
"براہ کرم...... مجھے مایوس نہ کیجئے گا...... میں نے سب کچھ آپ کو بتا دیا ہے۔ میں آپ کے معیار کے مطابق ڈھل جانے کی پوری کوشش کروں گا۔ آپ کو کبھی...... کبھی شکایت......"
جانے کیوں اسے جاوید کی بات پر ہنسی آ گئی۔ وہ یا تو بے حد بے وقوف تھا یا انتہائی بے رحم جو اتنی بے باکی سے سچائی بیان کر رہا تھا جو بار بار کہہ رہا تھا کہ اسے محبت کے علاوہ اسلم کی شخصیت دے دے گا۔ اس کا جی چاہا قہقہے لگائے۔
لیکن اس نے ہلکی سی ہنسی پر ہی اپنے آپ کو قابو کر لیا۔ جاوید مایوسانہ بیچارگی سے اسے تکتے ہوئے بولا۔ "اس بچی کے لیے آخری جتن جو میں کر سکتا تھا، یہی ہے......"
"آپ کو یقین ہے کہ علاج سے وہ ٹھیک ہو جائے گی۔؟" نورینہ نے تیکھی نظروں سے اسے دیکھا۔
"ہاں...... ڈاکٹروں کی یہی رائے ہے۔ سو فیصد یقین ہے۔" وہ جلدی سے بولا۔
وہ سر جھکائے پرس کی ڈوری سے کھیلتی رہی۔ پھر سر اٹھا کر جاوید کو دیکھا اور ہلکی سی بے رنگ مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔ "آپ کی بچی علاج سے ٹھیک ہو جائے...... پہلی جیسی بن کر آ جائے......"
جاوید نے مستفسرانہ اسے دیکھا۔

"ایسی صورت میں آپ بیوی اور بچی سے الگ رہ سکیں گے۔ میرا ساتھ دیتے رہیں گے؟"
"ہاں......" اس نے جلدی سے کہا۔ "میر لئے یہ تسکین کافی ہو گی کہ بے بی ٹھیک ہو گئی ہے۔ وہ معذور نہیں، مجبور نہیں۔ بے بس نہیں...... اذیت میں مبتلا نہیں۔ میں اسی بات سے تسکین پاؤں گا۔"
محبت کی یہ انتہا...... یہ معراج......
نورینہ نے نظر بھر کر اس دکھی انسان کو دیکھا...... اس کا جی چاہا۔ اس کے سامنے عقیدت سے سر جھکا دے۔ اس کے قدموں کی مٹی اپنی مانگ میں بھر لے۔
قربان ہو جانے کا کیسا انوکھا اور اچھوتا انداز تھا۔
بیرہ برتن لے گیا۔ جاوید نے پے منٹ کر دی۔ دونوں کئی لمحے چُپ بیٹھے رہے۔
پھر
نورینہ اٹھی۔
وہ بھی اٹھ کھڑا ہوا۔
دونوں خاموشی سے چلتے باہر نکل آئے۔ جاوید کی سائیکل سٹینڈ پر تھی۔ وہ نورینہ کے ساتھ گاڑی تک آیا۔
وہ گاڑی میں بیٹھتے ہوئے بولی۔ "میں آپ کو ڈراپ کر دوں گی۔"
جاوید نے سر نفی میں ہلایا اور بولا۔ "میں سائیکل پر آیا ہوں۔ چلا جاؤں گا۔"
نورینہ نے گاڑی سٹارٹ کر دی۔
"میری گزارش کا جواب......" جاوید نے لڑکھڑاتی زبان سے کہا۔
اس نے غور سے جاوید کو دیکھا اور آنکھوں پر چشمہ رکھتے ہوئے بولی۔
"سوچوں گی......"
"پلیز...... مایوس تو نہ کیجئے گا۔"
اس نے ہولے ہولے سر ہلایا اور ہاتھ ہلا کر گاڑی نکال لے گئی۔

"جاوید"
"ہوں"
"ہم نے......"
"کیا؟"
"ہم تینوں نے بے بی کے علاج کے لیے......"
جاوید نے چونک کر جمیل، ارشد اور ہمایوں کو دیکھا۔ تینوں اس کے گھر کے باہر گلی میں کھڑے تھے۔
"یار" جمیل بولا۔ "تم تو بے بی کے باپ ہو لیکن ایمان کی بات ہے کہ ہم سے اس کا دکھ نہیں دیکھا جاتا۔"
"ہم اس کے لیے خود تو کچھ نہیں کر سکتے۔" ارشد بولا۔ "لیکن ہم نے ایک سماجی ادارے سے بات چیت کی ہے۔"
"اوہ" جاوید ایک دم بولا...... "تو یہ آپ لوگوں نے......"
"ایک سماجی کارکن خاتون بے بی کو دیکھنے آئی تھی...... وہ اس کی میڈیکل رپورٹ بھی لے گئی......"
تینوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ جاوید ایک ہلکا سا تمسخرانہ انداز اختیار کرتے ہوئے بولا۔ "سماجی ادارے...... ہونھ۔ یہ کچھ کام کرنے کے اہل ہوتے تو رونا کس بات کا تھا۔ وہ خاتون اس کی ضروری رپورٹیں بھی لے گئیں اور اتنے دن ہو گئے۔ خود آئی ہیں نہ رپورٹیں واپس کی ہیں...... اتنا بڑا قدم یہ سماجی ادارے اٹھا بھی نہیں

سکتے...... فضول ہے۔ سب فضول......"
"لیکن......" ارشد نے کچھ کہنا چاہا
کہ اندر سے بے بی کے چیخنے کی آواز آئی۔ سماجی ادارے والی بات بیچ ہی میں رہ گئی۔ جاوید معذرت کر کے اندر چلا گیا۔
اور
تینوں باتیں کرتے گلی سے نکل گئے۔
جاوید نے بے بی کے علاج کے آخری حیلے کے لیے انتہا کو چھو لیا تھا۔ نورینہ کو پروپوزل دے کر وہ اس کے جواب کا انتظار کر رہا تھا امید و یاس کے درمیانی خلاء میں معلق تھا۔
اگر اس نے ہاں کر دی۔
تو
اور
اگر اس نے انکار کر دیا
تو
تو!
ہر وقت اس کے ذہن میں دونوں رویے برسرپیکار رہتے تھے۔ بے بی کی حالت جوں کی توں تھی۔ اب تو شاید تکالیف کا مقابلہ کرتے وہ بھی تھک گئی تھی۔ بڑی چڑچڑی، بدخو اور ضدی ہو گئی تھی۔ کبھی دوائی لینے سے انکار کر دیتی۔ کبھی جسم کو نرم رکھنے والی مرہم لگوانے سے انکاری ہو جاتی۔
جاوید ان حالات میں بے قراری سے نورینہ کے جواب کا منتظر تھا۔ گو انتظار میں خون جگر شامل تھا۔ وہ فاخرہ کو دیکھتا تو لگتا اک بے گناہ کے گلے میں پھندا ڈال رہا ہے۔ اسے اس مخلص خدمت گزار اور وفا شعار عورت سے کتنی محبت تھی...... یہ اس کا دل ہی جانتا تھا۔
لیکن

وہ کرتا بھی کیا۔
کتنے ہی دن گزر گئے۔
اسے نورینہ کی طرف سے جواب نہیں ملا۔ وہ دفتر جا رہا تھا، کام بھی کر رہا تھا اور کئی دفعہ نور احمد سے بھی سامنا ہوتا تھا۔ وہ خائف بھی ہوتا لیکن نور احمد کے کسی رویے سے ظاہر نہ ہوتا تھا کہ وہ جاوید کے پروپوزل سے واقف ہیں۔
اس بات سے اس کا دل ڈوبنے لگتا۔ علاج کا آخری سہارا بھی ختم ہوتا نظر آتا...... سوچ سوچ کر اس کے دماغ کی نسیں پھٹنے لگتیں۔ اسے یوں لگتا جیسے وہ اپنا ذہنی توازن کھو رہا ہے۔
اس دن چھٹی کے بعد وہ دفتر ہی میں ٹھہرا رہا۔ جمیل، ارشد اور ہمایوں چلے گئے تو اس نے باس کے کمرے کا رخ کیا۔ وہ جا چکا تھا۔ جاوید اس کی کرسی پر بیٹھ گیا۔ میز پر ٹیلی فون پڑا تھا۔
وہ آج نورینہ کو فون کر کے پوچھنا چاہتا تھا کہ اس نے اس کی درخواست مسترد کر دی یا منظور کر لی۔
دل کڑا کر کے اس نے نمبر ملایا۔ حسب معمول ملازم نے فون ریسیو کیا۔ جاوید کے کہنے پر اس نے نورینہ کو اطلاع دی۔
نورینہ نے فون کمرے ہی میں منگوا لیا۔ وہ صبح کی گئی گھنٹہ بھر پہلے گھر لوٹی تھی۔ اب کھانا کھا کر تھوڑی دیر آرام کرنے کے لیے کمرے میں آئی تھی۔
جاوید نے کچھ دیر انتظار کیا۔ فون سے مدھم مدھم آوازیں آ رہی تھیں جس سے اس کے دل کی دھک دھک بڑھ رہی تھی۔
"ہیلو" نورینہ کی آواز آئی۔ "نورینہ......"
"میں جاوید بول رہا ہوں"......
"جی"
"آپ خیریت سے ہیں نا؟"
"بالکل۔"

"شکر ہے گھر پہ ہی مل گئیں۔"

"آپ کی بچی کیسی ہے؟"

"جیسی تھی۔"

"کوئی امپرومنٹ؟"

"بغیر آپریشن کے ناممکن۔"

"ہوں۔"

"مس نورینہ"

"جی"

"آپ نے میری درخواست پر غور کیا؟"

"ہوں"

"پھر؟"

"پھر......میں......"

"جی......؟"

"دیکھئے جاوید......"

"اوہ پلیز......مجھے کچھ سمجھانے کی کوشش نہ کیجئے گا۔ مجھے ہاں یانہ میں جواب دیجئے......"

جاوید کے احتجاج پر نورینہ چند لمحے چپ رہی۔

"ہیلو......ہیلو" جاوید نے قدرے توقف کے بعد کہا۔

"جی" نورینہ کی ڈوبتی آواز آئی۔

"آپ نے کیا فیصلہ کیا؟"

"یہی کہ آپ......اسلم سے مشابہت ضرور رکھتے ہیں۔"

"پھر......؟"

"لیکن آپ اسلم نہیں......اسلم نہیں بن سکتے......صرف مشابہت پر زندگی کی بازی نہیں ہاری جاسکتی......پھر بھی......"

"پھر بھی......کیا؟" جاوید جھلا کر بولا۔

"کچھ دن اور سوچنے کی مہلت......"

"ٹھیک ہے۔ میں ہفتے کو پھر فون کروں گا۔"

"ہاں......پانچ دن بعد۔ میں یقیناً کوئی فیصلہ کرلوں گی۔"

فیصلہ تو نورینہ کرچکی تھی۔ جانے کیوں ایک دم بتادینے کو جی نہ چاہا۔ رابطے توڑنا آسان کام نہیں ہوتا۔ اس نے بہت سوچا تھا لیکن جاوید کی محبت ناپا کر بھی شادی کر لینا مضحکہ خیز تھا......

اور

اسے کھو کر بھی تو اطمینان نہ مل سکتا تھا۔ اس نے اپنا آپ ضرور پیش کر دیا تھا۔ وہ اسے منٹوں میں حاصل کر سکتی تھی۔

لیکن

نہیں

وہ ایسا نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اسے کھو دینا ضروری تھا، اطمینان نہ سہی لیکن کھو دینا ضروری تھا۔

جھلایا ہوا جاوید ڈیوڑھی میں داخل ہوا تو سائیکل دیوار کے ساتھ لگنے کی بجائے گر گئی۔ فاخرہ لپک کر آئی۔

"کیا ہوا؟"

"ہر بات پوچھنے کی عادت ہی بن گئی ہے تمہاری۔" اس نے غصے سے کہا۔

فاخرہ چپ چاپ ایک طرف کو ہو گئی۔

جاوید نے سائیکل دیوار کے ساتھ کھڑی کر دی اور لڑکھڑاتے قدموں سے اندر چلا آیا۔

"ابو۔" بے بی نے باپ کو پکارا۔

"کیا ہے۔" وہ اس سے بھی اُلجھ گیا۔

"ابو جی۔" وہ رو دینے کو تھی۔

وہ جواب دینے کی بجائے دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ مایوسی اور ذہنی بار نے اتنا پریشان کر رکھا تھا کہ اسے اپنے آپ، اپنے گھر، اپنی بیوی حتیٰ کہ اپنی بیمار بچی سے بھی الجھن محسوس ہونے لگی۔

نورینہ کا جواب گو ادھورا تھا لیکن وہ اسے اپنے طور پر مکمل کر سکتا تھا۔ اثبات کی گنجائش نظر نہیں آتی۔ اسے نورینہ پر بھی بے پناہ غصہ آرہا تھا۔

لیکن

جب گھنٹوں کے الجھاؤ اور غصے کے بعد اس نے ذرا سکون سے سوچا تو نورینہ اسے حق بجانب نظر آئی وہ اپنی غرض اس پر مسلط کر کے اسے مجبور تو نہیں کر سکتا تھا۔

مجبور کرنے کا اسے حق بھی کیا تھا۔

دو تین دن یونہی گزر گئے۔ اس کا غصہ کبھی انتہا کو پہنچ جاتا۔ وہ بے بی کو بھی بے دریغ جھڑک دیتا۔

اس شام بے بی نے بڑے دکھ سے کہا۔ "ابو اس جگہ بڑا درد ہو رہا ہے۔" تو وہ پیار کرنے یا دلاسہ دینے کی بجائے جھلا کر چیخا۔ "میں کیا کروں۔ مجھے کیوں بتاتی ہے......میں ہی رہ گیا ہوں......"

بے بی سہم گئی۔ خوفزدہ سی ہو کر اسے تکنے لگی۔ وہ اٹھ کر باہر چلا گیا اور رات گئے گھر واپس آیا۔

فاخرہ اس کے انتظار میں بیٹھی تھی......وہ آیا تو اس نے ملائمت سے کہا۔

"اتنی دیر تک کہاں رہے......بے بی کی گولیاں بھی لانا تھیں......"

جاوید نے خونخوار نظروں سے فاخرہ کو دیکھا۔ بے بی کے اٹھ جانے کا خیال نہ ہوتا تو وہ غصے سے چیخ چیخ کر بیوی کو کہتا۔ "بکواس بند کر۔ خبردار جو آئندہ مجھ سے اس سلسلہ میں کوئی بات کی......"

وہ زمین پر زور سے بوٹ کی ٹھوکر لگاتا کمرے میں چلا گیا۔ فاخرہ سمجھ نہ پائی کہ کیا کرے۔ منہ سر لپیٹ کر بستر پر پڑ گئی۔ اس دن اس نے جاوید کو کھانے کا بھی نہیں پوچھا۔ اسے بھی غصہ آگیا۔

اس رات جاوید دیر تک نہ سو سکا۔ اندر ہی اندر جلتا اور کڑھتا رہا۔ اس کی آخری امید بھی ٹوٹ گئی تھی۔ وہ یہی سوچ سوچ کر پریشان ہوتا رہا کہ اب عمر بھر بے بی جیتا جاگتا عذاب بنی رہے گی......

یہ سب سوچیں اس کا ذہن اُتھل پتھل کر رہی تھیں۔ دماغ کی نسیں تن جاتیں۔ کبھی کبھی تو یوں لگتا یہ تناؤ اک ایسی سٹیج پر آرہا ہے کہ خود اپنے زور ہی سے ٹوٹ جائے گا۔

اپنے غصے اور جھلاہٹ پر جب قابو پالیتا تو وہ فاخرہ سے بھی نارمل ہو جاتا اور بچی کو خوب پیار کرتا۔

اس کی ذہنی کیفیت مخدوش ہوتی جا رہی تھی۔

فاخرہ کو نیند نہیں آرہی تھی۔ جب جاوید صحن میں آیا تو وہ جاگ رہی تھی لیکن ویسے ہی پڑی تھی۔

جاوید بے بی کے سرہانے کھڑا ہو گیا۔

پھر

جھکا

اور آہستہ آہستہ اس کے بالوں کو اپنے ہونٹوں سے چھونے لگا۔

فاخرہ نے محسوس کیا کہ بچی کو پیار کرتے ہوئے جاوید اپنی بے قابو سسکیوں کو بڑی مشکل سے قابو میں کر رہا ہے۔

کیا کیا فریب دل کو دینے والی بات تھی۔ نورینہ نے خدمت خلق شروع کر دی تھی۔ اپنی ذات سے ہٹ کر سوچوں میں ڈگر قائم کر لی تھی۔ اپنے آپ کو بے حد پابند اور بہت مصروف کر لیا تھا۔

لیکن

دل اور اس کے تقاضے تو اپنی جگہ تھے ہی۔ وہ اب میچور لڑکی تھی اور یہ میچورٹی ہی عذابِ جان تھی۔ جاوید کے پروپوزل نے ایک بار پھر اس کی دنیا متزلزل کر دی تھی۔ وہ اس پروپوزل کے ہر پہلو کو جانچ پرکھ سکتی تھی۔ بچی نہ تھی کہ دل کو دلاسے دے لیتی۔ اس پروپوزل پر صادر کر دیتی اور انجام و عواقب کی خبر لئے بغیر حامی بھر لیتی۔

اسے اپنے سامنے یہ اعتراف کرتے ہوئے بھی باک نہ تھا کہ جاوید کو اس کی اسلم سے الگ شخصیت جان کر چاہنے لگی ہے۔ وہ اپنے آپ سے جھوٹ نہ بول سکتی تھی۔ یہ اتنا اجلا اور صاف ستھرا سچ تھا کہ اس سے آنکھیں چرانا ممکن ہی نہ تھا۔ یہ اس کی زندگی میں آنے والا تیسرا مرد تھا۔ اس نے ہر مرد کو پیار و محبت کے سنگھاسن پر بٹھایا تھا جس کی منکوحہ تھی، اسے بھی پیار کیا تھا۔ جس کی منگیتر تھی، اس سے بھی راہِ محبت استوار کی تھی۔

اور

اور

جس کی منکوحہ تھی نہ محبوبہ

اسے تو دل کی گہرائیوں سے چاہنے لگی تھی۔ اسے تو یوں لگتا تھا کہ سچے پیار کی روشنی اس نے اب پائی ہے..... اب تک جن دو مردوں سے رابطہ رہا تھا، ان سے صرف جذباتیت نے وابستہ کیا ہوا تھا۔ پیار کے سلگاؤ تو اب محسوس کئے تھے۔ لذت آشناب ہوئی تھی۔ کسی سے ٹوٹ کر پیار کرنے کا احساس تو اب جاگا تھا۔

جاوید نے پروپوزل دیا تھا۔

فیصلہ اب اس نے کرنا تھا۔

کنواں چل کر پیاسے کے پاس آ گیا تھا۔ طوفان میں ہچکولے کھاتی کشتی کو لہروں ہی میں کنارا مل رہا تھا۔

لیکن

معاملہ ایسا تھا کہ کنویں کی منڈیر پر بیٹھ کر بھی پیاس نہ بجھائی جا سکتی تھی..... کنارہ ہاتھ آتے ہوئے بھی چھوٹا ہوا تھا۔

جاوید شادی شدہ تھا۔ ایک بچی کا باپ تھا۔ اپنی بیوی اور بچی سے جنون کی حد تک پیار کرتا تھا۔

اسی پیار نے مجبور کر دیا تھا کہ وہ نورینہ کے حوالے اپنا آپ کر دے۔

یہ

جانتے ہوئے بھی ایک ہوش مند لڑکی کس طرح اس کے حق میں فیصلہ کر لیتی۔ حق میں فیصلہ نہ کرنا بھی اذیت دہ تھا اور حق میں کرنا بھی دکھ اور اذیت کا باعث.....

سوچوں نے اسے پریشان کر دیا۔ نڈھال اور بے چین رہی۔ اپنے آپ کو زیادہ سے زیادہ مصروف رکھنے کے لیے وہ سارا سارا دن رفاحی کام کرتی رہی۔ اس نے بہت کچھ کیا۔

بہت کچھ

لیکن دل مضطرب کی تسکین کا کوئی پہلو ہاتھ نہ آیا۔ اور جب جاوید نے اپنی درخواست کی یاددہانی کے لیے فون کیا تو وہ کوشش کے باوجود ایک دم انکار نہ کر سکی۔

اس نے سوچنے کے لیے چند دن کی اور مہلت مانگ لی۔

یہ

چند دن اس کے لیے جان لیوا عذاب بن گئے۔ کٹھن منزلوں سے انہی دنوں اسے گزرنا پڑا۔ آگ کی لپٹوں سے نبرد آزما ہونا تھا.....

وہ اتنی پریشان تھی کہ ممی اور ڈیڈی کی نگاہوں سے پریشانی چُھپ نہ سکی۔ ممی نے پوچھا..... ڈیڈی نے پیار سے کھوج لگانا چاہی۔

وہ خاموش رہی۔ ماں باپ پر اپنی اذیت آشکار کر کے انہیں بے سکون کرنا نہیں چاہتی تھی۔ دونوں سے ایک ہی بات کہی۔ "ان دنوں ایک غریب خاندان کی بیچارگی ذہن پر مسلط ہے۔ میں ان کے لیے کچھ کر رہی ہوں۔ جب کر لوں گی، ذہن سے بوجھ خود ہی اتر جائے گا۔"

"پیسے کی پرابلم تو نہیں؟"

وہ چپ ہو گئی۔ اس نے پیسے کا مسئلہ حل کر لیا تھا۔ انہیں بتانے کی ضرورت نہ تھی۔

پیسہ اس کی نگاہوں میں وقعت نہیں رکھتا تھا۔ اس کے اپنے اکاؤنٹ میں ابھی کافی رقم تھی۔ معاملہ تو دل کا تھا..... فیصلے کا تھا..... ہفتے کو اس نے جاوید کو آخری فیصلے سے مطلع کرنا تھا۔

لیکن

ہفتے کی بجائے جمعہ ہی کو جاوید کا فون آ گیا۔

وہ نہا دھو کر کمرے سے باہر آئی تھی۔ ممی اور ڈیڈی کسی کے ہاں گئے تھے۔ ندید اور سعید باہر لان میں تھے۔ فون کی گھنٹی بجی۔ وہ لابی ہی میں تھی۔

"ہیلو..... جاوید"

"جی۔"

"میں نورینہ بول رہی ہوں۔"

"جی میں جانتا ہوں۔"

"فرمائیے۔ کوئی ضروری بات ہے۔ ویسے فون تو آپ نے کل کرنا تھا۔"

"آج ہی کر رہا ہوں۔"

"وعدے پر قائم رہنا سیکھیے۔"

"مس نورینہ"

"ہوں"

"میں معذرت خواہ ہوں۔"

"جی"

"میں نے جو پروپوزل دیا تھا نا....."

"ہوں ہوں"

"اسے ڈراپ کر دیجئے....."

نورینہ نے بڑے سکون اور اطمینان سے پوچھا۔ "ضرورت پوری ہو گئی؟"

"ہاں میری بچی کے علاج کا بندوبست ہو گیا ہے۔ مجھے بے حد افسوس ہے لیکن....."

"افسوس کس بات کا جاوید صاحب؟"

وہ چپ رہا۔

"پروپوزل واپس لینے کا؟" نورینہ نے تحمل سے کہا۔ گو اس کی آواز لرز گئی۔

"ہاں..... میں نادم ہوں۔ آپ کو ڈسٹرب کیا..... ذہنی اذیت دے رہا ہوں۔"

"اوہ جاوید صاحب۔" نورینہ نے ایک کھوکھلا قہقہہ لگا کر کہا۔ "ایسی کوئی بات نہیں۔ اپنا سفینہ تو ہمیشہ ہی کنارے سے ٹکرا کر ڈوبا ہے۔"

"نورینہ....." جاوید کی آواز فرط جذبات سے رندھ گئی۔ اسے شاید اس مظلوم اور پیاری سی لڑکی پر ترس آ رہا تھا۔

وہ پھر ہنسی..... جاوید اس ہنسی سے بڑا خوفزدہ سا ہو گیا۔ معذرتانہ انداز میں بولا۔ "مجھے افسوس ہے۔ میں بے حد نادم ہوں۔ آپ مجھے معاف کر دیجئے گا..... میری مجبوری..... کو آپ اچھی طرح سمجھتی ہیں....."

"ہاں....."

"پلیز نورینہ..... میں..... میں آپ کو اذیت دے رہا ہوں..... لیکن میری پوزیشن....."

"سب ٹھیک ہے۔" وہ گلوگیر آواز میں بولی..... پھر اس موضوع سے ہٹتے ہوئے کہا۔

"آپ کب لے کر جا رہے ہیں بچی کو؟"

"عنقریب۔"

"خدا کرے بچی ٹھیک ہو جائے اور آپ اپنی فیملی میں مسرور و مطمئن رہیں....."

"نورینہ....." جاوید کی آواز میں دکھ تھا جسے نورینہ نے محسوس کیا وہ بولا۔

"آپ اتنی عظیم اور اتنی بلند ہیں..... مجھے اپنا آپ۔ آپ کے سامنے حقیر لگ رہا ہے لیکن میں مجبور ہوں۔"

"خدا حافظ۔"

نورینہ نے فون بند کر دیا۔ کچھ اور سننے کہنے کا شاید یارا ہی نہ رہا تھا۔ وہ لہراتی ہوئی اپنے کمرے کی طرف گئی۔ دروازہ بند کیا اور بستر میں گر کر بے اختیارانہ رونے لگی۔ اپنی محرومیوں پر آنسو بہانے کا تو حق رکھتی تھی۔ محبت کے لاشے کو روند کر فرض نبھا بھی دیا جائے..... لاشے پر ماتم کناں ہونے کا حق تو رہتا ہی ہے۔

فاخرہ تو حیرت سے بُت بن گئی۔ کئی لمحے تو اسے یقین ہی نہ آیا کہ جو کچھ دیکھ رہی ہے، سُن رہی ہے حقیقت ہے، زندہ حقیقت۔

وہی خاتون

وہی سوشل ورکر آئی تھی۔ اس کے سامنے کرسی پر بیٹھی تھی۔ اس نے ایک سیاہ بیگ فاخرہ کے حوالے کیا تھا۔ بے بی کی رپورٹیں واپس کی تھیں اور ایک نئی فائل فاخرہ کو تھمادی تھی اور جو کچھ اس نے کہا تھا۔ وہ فاخرہ کے لیے ناقابلِ یقین تھا۔ اسے جاگتے میں خواب کا گماں ہوا۔

خاتون کہہ رہی تھی۔ "سارے کوائف اس فائل میں ہیں۔ بچی کی ہوسپٹل میں ایڈمشن ہو جائے گی۔ ڈاکٹروں سے بات ہو چکی ہے۔ اب آپ یا جاوید صاحب جو بھی بچی کو لے کر جانا چاہے۔ یہاں کی فارمیلیٹز پوری کر لیں۔ پاسپورٹ ارجنٹ بن سکتے ہیں۔ روپے کی منظوری میں نے لے لی ہے۔ دو خط بھی اس فائل میں ہیں۔ وہاں مزید پیسے کی ضرورت پڑ جائے تو یہ خط متعلقہ افراد کو دے کر پیسہ مل سکتا ہے۔"

فاخرہ حیرت سے پھٹی پھٹی نگاہوں سے اس خاتون کو جو خاتون نہیں، ان کے لیے فرشتۂ رحمت تھی، تک رہی تھی۔

"آپ کی بچی خدا نے چاہا تو بالکل صحیح و سلامت واپس آئے گی۔ فائل میں میں نے ساری چیزیں ترتیب وار لگا دی ہیں۔ اب آپ لوگوں نے پاسپورٹ بنوانا ہے اور بچی کو نیویارک لے جانا ہے۔ خدا کرے بچی سلامت رہے اور ہمیشہ خوش و خرم....."

وہ خاتون کرسی سے اٹھتی ہوئی بولی۔ "بیگ میں پیسہ ہے۔ کچھ ڈالر سٹیٹ بینک سے ملے۔ کچھ میں نے دوڑ دھوپ کر کے حاصل کیے ہیں۔ آپ کو اس سلسلہ میں

اب یقیناً کچھ نہیں کرنا پڑے گا۔ یہ رقم کافی ہو گی۔"

فاخرہ گنگ سی کھڑی تھی۔ فرط مسرت سے جیسے پاگل ہو کر اس خاتون سے لپٹ گئی۔ اس کے پاس اظہار تشکر کو الفاظ نہ تھے۔ زبان لڑکھڑا لڑکھڑا گئی۔ آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں۔ رقت سے بولی۔ "آپ فرشتۂ رحمت ہیں۔ ہم لوگ آپ کا احسان نہیں اتار سکیں گے۔ آپ نے اتنا کچھ کر دیا ہے۔"

"کوئی بات نہیں۔" خاتون نے اس کے کانپتے وجود کو بازو کا سہارا دے کر تھپتھپایا..... وہ خود بھی کانپ رہی تھی۔ اس کا چہرہ اداس تھا۔ آنکھیں ویران ویران تھیں۔

"میری خوش نصیبی ہے کہ قدرت نے میرے ہاتھوں یہ چھوٹا سا کام کروا دیا۔ کسی کا دُکھ بانٹ کر..... کسی کا سہارا بن کر جو خوشی نصیب ہوتی ہے، میرے لئے یہی بڑا انعام ہے....." خاتون کی آنکھیں جھلملا گئیں۔ اس نے جلدی سے رخ پھیر لیا۔

"آپ انسان نہیں فرشتہ ہیں۔" فاخرہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔

خاتون نے فاخرہ کے کندھے کو ہولے سے تھپتھپایا۔ پھر بے بی پر جھک گئی۔

"بے بی۔ آپ بالکل ٹھیک ہو کر امریکہ سے واپس آئیں گی تو میں آپ سے ملنے آؤں گی۔ پھر ہم دونوں خوب کھیلیں گے....."

بے بی بیچارگی سے اسے تکتے ہوئے بولی۔ "آنٹی آپ مجھے بڑی اچھی لگی ہیں۔ میں ضرور آپ کے ساتھ کھیلا کروں گی..... کیا میں کھیل سکوں گی؟"

"خدا کرے گا..... ضرور کرے گا۔ آپ علاج کے بعد بالکل ٹھیک ہو جائیں گی۔"

فاخرہ عقیدت سے خاتون کو تک رہی تھی۔ ابھی تک اسے پوری طرح یقین نہ آیا تھا کہ خاتون نے جو کچھ کہا ہے، حقیقت ہے۔

خاتون جانے کے لیے مڑی۔ بے بی نے اسے سلام کیا۔

وہ خدا حافظ کہہ کر کمرے سے نکل گئی۔ فاخرہ اسے دروازے تک چھوڑنے گئی۔ وہ شکریہ ادا کر کے بے حال ہوئی جا رہی تھی۔

خاتون چلی گئی تو اس نے دروازے کی کنڈی چڑھا دی۔ پھر تیزی سے قدم اٹھاتی کمرے میں آئی۔ فائل تو اس نے کیا کرنی تھی دیکھ کر، جلدی سے اس نے بیگ کھولا۔

اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔

بیگ میں ایک خطیر رقم تھی۔

وہ باؤلی سی ہو کر بے بی کے پاس بیٹھ گئی۔ بیگ سے ڈالروں کی گڈی نکالی، روپوں کے سو سو کے لال لال نوٹ نکالے اور پاگلوں کی طرح بے بی کے آگے ڈال کر بولی۔ "بے بی...... تیرا علاج ہو گا۔ بے بی دیکھ اس خاتون نے تیرے لیے کیا کچھ کیا ہے۔"

پھر وہ فرش پر سجدے میں گر گئی۔ اس کا رواں رواں خدا کا شکر گزار تھا۔ ان ہونی ہو گئی تھی۔ جس بات کا تصور بھی وہ نہ کر سکتی تھی۔ وہ ممکن دکھائی دے رہا تھا۔

بے بی خوش ہو گئی...... وہ فاخرہ سے کئی سوال کرنے لگی۔ اس نے پوچھا۔ "امی اس آنٹی کا کیا نام ہے......؟"

فاخرہ کو غلطی کا احساس ہوا۔ فرط جذبات سے مغلوب ہو کر وہ اس محسنہ کا نام ہی نہ پوچھ سکی تھی۔ اس کا نام کیا تھا؟ وہ کون تھی؟ کہاں سے آئی تھی؟ کہاں رہتی تھی؟ اسے کچھ پتہ نہ تھا۔

جاوید دفتر سے حسب معمول اکتایا اور جھلایا ہوا گھر آیا۔ نورینہ سے تاحال کوئی جواب نہ ملا تھا۔ اسی لئے الجھاؤ بڑھ گیا تھا۔ کل چھٹی تھی اور پرسوں جاوید نے فون کر کے اس کا آخری فیصلہ پوچھنا تھا۔ وقت جوں جوں گزر رہا تھا، اس کی بے چینی بڑھ رہی تھی اور وہ بے حد چڑچڑا ہو رہا تھا۔

فاخرہ نے دروازہ کھولا...... بمشکل وہ اپنے آپ پر قابو پائے رہی لیکن جاوید صحن میں آیا تو وہ اس سے لپٹ گئی۔ "جاوید...... جاوید۔ بے بی علاج کے لیے امریکہ جائے گی۔ اس کا علاج ہو جائے گا۔ اس کا علاج ہو جائے گا جاوید......"

جاوید پہلے تو سمجھ نہ پایا۔ فاخرہ کو اپنے سے الگ کرتے ہوئے پوچھا۔ "دماغ خراب تو نہیں ہو گیا؟"

"نہیں۔ نہیں جاوید نہیں۔ آپ اندر تو چلیں۔" وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچتے ہوئے اندر لے آئی۔

"یہ دیکھیں...... یہ دیکھیں۔" اس نے نوٹوں سے بھرا بیگ اس کے سامنے

میز پر اُلٹ دیا۔

جاوید بھونچکا رہ گیا۔ حیرت سے کبھی فاخرہ اور کبھی نوٹوں کو تکنے لگا۔

فاخرہ فرط مسرت سے جھوم کر بولی۔ "اللہ بڑا کارساز ہے جاوید۔ ہمارے دکھی دلوں کی پکار اُس نے سُن لی۔"

"لیکن یہ روپیہ...... یہ تو ڈالر ہیں۔"

"ہاں......"

"کہاں سے آئے؟"

"وہ...... وہ خاتون دے گئی۔"

"کون؟"

"وہی سوشل ورکر...... جو مہینہ بھر پہلے آئی تھی۔"

جاوید ہکا بکا سا رہ گیا۔ جلدی سے بولا۔ "وہ کون ہے، اس کا نام کیا ہے۔ وہ کس ادارے کی رکن ہے؟"

فاخرہ چُپ ہو گئی۔ پھر آہستگی سے بولی۔ "پتہ نہیں۔"

جاوید پر اور حیرانگی ٹوٹی۔ "تم نے پوچھا نہیں؟"

"نہیں...... میں تو ششدر رہ گئی تھی۔ اس نے اپنا نام و پتہ بتایا ہی نہیں۔ نہ ہی جذبات کی ہلچل میں مجھے پوچھنا یاد رہا۔"

"پاگل ہو تم۔"

"ہاں میں پاگل ہی ہو گئی تھی جاوید...... کیا یہ پاگل ہونے والی بات نہیں۔ جو بات ہم سوچ بھی نہیں سکتے تھے، وہ پوری ہو گئی۔ اس نے بچی کے ایڈمشن کا بندوبست بھی کر دیا ہے۔ سٹیٹ بینک سے پیسے کی منظوری لے کر ڈالر بھی لے لیے ہیں...... دیکھو نا یہ فائل۔ اس نے سب کچھ اس نے لکھ رکھا ہے۔ سب کچھ......"

جاوید جلدی جلدی سے فائل دیکھنے لگا۔ نیویارک کے میڈیکل سنٹر کے ڈاکٹر واٹسن سے جو کچھ طے ہوا تھا، فائل میں کاغذ لگے تھے۔ جتنے ڈالر تھے، ان کی سٹیٹ بینک کی سٹیٹمنٹ تھی۔ کچھ پاکستانی روپیہ تھا جو پاسپورٹ اور کپڑوں وغیرہ کے لیے تھا۔ اس کے

علاوہ وہاں کے دو افراد کے نام دو خط تھے۔ دونوں کے نیچے الگ الگ دستخط تھے۔ اس خاتون نے شاید اپنے جاننے والوں سے کرنسی کا تبادلہ کیا تھا۔ بوقت ضرورت یہ رقم وہاں ڈالروں کی صورت لی جا سکتی تھی......

فائل دیکھ کر جاوید نے میز پر رکھ دی۔ اس نے اپنی گردن کرسی کی پشت پر ڈال دی۔

"یا خدا...... تیری دنیا میں ایسے بھی لوگ ہیں۔"

گھنٹہ بھر اسے نارمل ہونے میں لگا۔

پھر وہ اطمینان سے فائیل اور میڈیکل رپورٹیں لے کر بیٹھ گیا۔ سارا کام اتنی ترتیب اور سلیقے سے کیا گیا تھا کہ جاوید کو کسی وقت دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑ سکتا تھا۔ ہر چیز جامع اور مکمل تھی۔

شام جیسے خوشیوں کے جگنو چمکاتی اتری۔ ایک عرصے کے بعد جاوید اور فاخرہ کے چہروں پر مسرت کے پھول کھِل اُٹھے۔ وہ بات بات پر ہنسے بات بات پر مسکرائے

اور رات

جب

جاوید بے بی کو باہر لے جانے کے انتظامات کی فاخرہ سے باتیں کرنے لگا تو اسے اپنے پروپوزل کے خیال سے جھنجھنی سی آ گئی۔ وہ اندر ہی اندر کانپ گیا۔ اس نے فاخرہ کو بازوؤں میں بھر کر سینے سے لگا لیا اور اسے اتنا پیار کیا کہ وہ گھبرا کر اپنا آپ اس سے چھڑانے لگی۔

وہ پیار کے اس اظہار کو بے بی کے علاج کی خوشی پر محمول کر رہی تھی۔

لیکن

جاوید تو اس لئے اسے ٹوٹ کر پیار کر رہا تھا کہ یہ اظہار تشکر تھا اس بات کا کہ اس سے چھوٹ کر بچھڑ نہیں گیا تھا...... مجبوری نے اسے سچ مچ ہی بیچ نہیں ڈالا تھا۔

وہ بچ گیا تھا۔

فاخرہ کے لیے

اپنی اس عزیز ہستی کے لیے

پھر

دوسرے دن ہی اس نے نورینہ کو فون کرنے کا سوچا۔ وہ اسے بتا دینا چاہتا تھا کہ اب اسے اس کے قدموں میں لٹنے کی ضرورت نہیں رہی۔

بچی کو علاج کے لیے باہر لے جانے کی خبر دوستوں، عزیزوں اور رشتہ داروں کو ملی تو اس عطیہ غیبی پر سب حیران رہ گئے۔

"دنیا میں ایسے لوگ بھی ہیں جو ایک ہاتھ سے دیتے ہیں تو دوسرے کو خبر نہیں ہوتی۔"

"یہ جہاں نیک بندوں سے ابھی خالی نہیں ہوا۔"

"کس خدا ترس نے اتنی بڑی نیکی کی؟"

"اصلی نیکی یہی ہے۔ نام تک نہیں بتلایا نیکی کرنے والے نے۔"

لوگوں کے لیے یہ اچنبھے کی بات تھی اور وہ قائل ہو گئے تھے کہ ساری خرابیوں، ساری برائیوں کے باوجود دنیا میں ایسے لوگ بھی ہیں جو فرشتے ہیں۔ بے لوث خدمت کرتے ہیں اور نام تک نہیں بتاتے۔ اتنی عظمت، ایسی بڑائی اور اتنی اونچائی پر بھی لوگوں کے نشان ملتے تھے۔

ارشد، جمیل اور ہمایوں کو بھی پتہ چلا تو وہ حیران و ششدر رہ گئے۔ انہیں توقع کب تھی اور جس سوشل ورکر سے وہ ملتے تھے، اس نے تو اتنی گراں ذمہ داری اٹھانے کی ذمہ داری تک نہ بھری تھی، معاملہ پیچیدہ تھا لیکن اس وقت پیچیدگیوں میں الجھنے کی کسے فرصت تھی......

جاوید اور فاخرہ تو تیاریوں میں جُت گئے تھے۔ جاوید پاسپورٹ کے چکروں میں تھا۔ دفتر سے چھٹی لینی تھی اور بہت سی کاغذی کارروائیاں تھیں۔ فاخرہ بازاروں کے چکر لگا رہی تھی۔ بے بی کے لیے ایسے لبادہ نما کُرتے بنوا رہی تھی جو سہولت سے اسے پہنائے جا سکیں۔

جاوید اور فاخرہ کی کوشش تھی کہ سارے کام دنوں کی بجائے گھنٹوں میں نمٹ جائیں۔

دن رات کی دوڑ دھوپ کے بعد تیاری مکمل ہو ہی گئی...... فاخرہ نے سارے

کام خوشی خوشی کیے۔ اس کا پاؤں زمین پر نہ پڑتا تھا۔ بے بی کے ٹھیک ہو جانے کے تصور سے ہی وہ جھوم اٹھتی تھی۔

کام جاوید بھی کر رہا تھا۔ دوڑ دھوپ بھی اور ضروری کارروائیوں کے لیے تگ و دو بھی۔ بے بی کا علاج ہونے کی اسے بھی خوشی تھی۔

لیکن

کبھی کبھی

نورینہ کا خیال آ جاتا تو اداسی کی کٹار اندر ہی اتر جاتی۔ وہ بدقسمت سی لڑکی اپنے دل کے کہیں آس پاس محسوس ہوتی تو وہ پریشان ہو جاتا۔ فون پر کہا ہوا اس کا یہ جملہ "اپنا سفینہ تو ہمیشہ ہی کنارے سے ٹکرا کر ڈوبا ہے۔" سوز و گداز دل میں بھر دیتا۔ وہ بے کل ہو جاتا...... اور پشیمان ہو کر دل ہی دل میں کہتا۔ "کاش میں تمہارے دکھ بانٹ سکتا......"

دل میں اک انوکھے درد کی لذت لیے وہ تیاری میں مصروف رہا۔

ہم سمجھتے ہیں کہ انسان ایک وقت میں ایک ہی محبت کرتا ہے لیکن ایسا نہیں ہوتا۔ ہم ایک ہی وقت میں کئی کئی محبتیں کرتے ہیں۔ ان محبتوں کی صورتیں جدا جدا ہوتی ہیں۔ ہم بیک وقت اپنے خون کے رشتوں، سماجی ناطوں اور قربت کے تعلقوں سے پیار کرتے ہیں۔ وہ محبتیں جن میں جنس شامل ہوتی ہے، شاید ایک وقت میں ایک ہی فرد سے کی جائے۔

لیکن

محبتیں جنس سے پاک، اس سے الگ اور اس سے ماورا بھی تو ہوتی ہیں۔ ان محبتوں میں طلب نہیں ہوتی۔ ملن کی خواہش نہیں ہوتی۔ پا لینے کی خوشی اور بچھڑ جانے کا غم نہیں ہوتا۔

پھر بھی یہ اپنا وجود منواتی ہیں۔

اپنے ہونے کا احساس دلاتی ہیں۔

کسی ایسی محبت نے ایسے ہی بے نام جذبے نے جاوید کے دل میں بھی جگہ بنا لی تھی...... وہ اسے سینے میں چھپائے بچی کو باہر لے جانے کی تیاریوں میں مصروف تھا۔ علاج ہونے کی خوشی بھی تھی اور فاخرہ سے کئی ماہ الگ رہنے کا احساس بھی۔

دفتر سے اس نے چھ ماہ کی رخصت لے لی۔ آخری دن وہ دفتر اپنے کولیگز دوستوں اور نور احمد سے ملنے گیا۔

نور احمد نے اس سے مصافحہ کیا اور بڑے سرد لہجے میں بولے "خدا کرے تمہاری بچی ٹھیک ہو جائے۔"

جاوید کا دل دکھ گیا۔ بچیوں کا دکھ مشترک تھا۔ وہ ان کے لہجے کی ٹھنڈک سے ان کے دل کا درد بھانپ گیا۔

صرف "شکریہ" کہہ کر وہ دفتر سے باہر آ گیا۔

دوسرے دن ایئرپورٹ پر کافی لوگ جاوید اور بے بی کو رخصت کرنے آئے تھے۔ دعاؤں سے نواز رہے تھے۔ نیک خواہشات کا اظہار کر رہے تھے۔

جاوید اور فاخرہ دونوں سب کا شکریہ ادا کر رہے تھے۔

جہاز کی روانگی کے وقت کا اعلان ہوا۔ فاخرہ نے روتی آنکھوں اور مسکراتے چہرے سے باپ بیٹی کو دیکھا۔

جاوید بھی فاخرہ کو دیکھ دیکھ کر دلگیر ہو گیا۔ چھ ماہ تو لگ ہی جانے کی توقع تھی۔ یہ چھ ماہ فاخرہ نے شوہر اور بچی کے بغیر اپنے دیور کے ہاں رہ کر لمحہ لمحہ انتظار کر کے گزارنا تھے۔

سب سے مل کر جاوید نے بے بی کو ہاتھوں پر یوں احتیاط سے اٹھایا۔ جیسے وہ کوئی کانچ کا نازک سا برتن ہو جو ذرا سی ٹھیس سے بھی ٹوٹ پھوٹ کر بکھر سکتا ہو۔ بے بی کراہی۔

جاوید نے اس کی پیشانی پر ہونٹ رکھ دیئے اور پیار میں ڈوب کر بولا۔ "بس میری جان تکلیف کے دن جلد ختم ہو جائیں گے۔"

وہ بچی کو لے کر اندر چلا گیا۔

فاخرہ کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی۔ اسے بڑی نند نے ساتھ لپٹا لیا۔ جہاز کے اڑان لینے تک وہ سب لوگ بیرونی جنگلے کے ساتھ لگے کھڑے رہے۔

جہاز نظروں سے اوجھل ہو گیا تو سب لوگ واپس لوٹ گئے۔

زبیدہ ناصر نور احمد کے ہاں دو تین دفعہ آچکی تھی۔ اپنے بیٹے کے لیے اس نے نورینہ کو پسند کیا تھا۔ ماں کی پسند اتنی خوبصورت تھی کہ بیٹے کے معیار پر بھی پوری اتری۔ ابھی تک تو پسند کا اظہار اشاروں کنایوں میں ہی ہو رہا تھا لیکن آج زبیدہ بات کرنے ہی کے لیے آ رہی تھی۔

اس نے کل شام فون کیا تھا۔ "میں کل آؤں گی...... اپنی جھولی پھیلانے۔"

ممی نے دل سے اس بات کو سراہا تھا۔ رات نور احمد سے بھی کافی دیر تک وہ یہی بات کرتی رہی تھیں۔

نور احمد کیا کہتے۔ ساری تعریفیں سننے کے بعد صرف یہی کہا۔ "نورینہ سے پوچھ لو...... اگر وہ حامی بھر لے تو مجھے کیا اعتراض۔"

ممی بپھر کر بولی تھیں۔ "اسے تو آپ نے کھلی چھٹی دے رکھی ہے۔ جانے کیا کچھ کرتی پھرتی ہے۔"

"نیکی کے کام خوشیاں بانٹتی پھرتی ہے......"

"میرے خیال میں اس کا بینک بیلنس نل ہو چکا ہو گا۔"

"کافی خرچ کر چکی ہے۔"

"آپ کچھ کہتے ہی نہیں اسے۔"

"میں کیا کہوں۔ وہ بچی نہیں اب، بالغ لڑکی ہے۔ اسے اپنے حصے کا پیسہ خرچ کرنے کا حق حاصل ہے۔"

"لاکھوں کے حساب سے۔"

"چلو ایک کیس تھا، ہو گیا۔ اسے خوشی تو حاصل ہوئی۔"

"ہونھ...... خوشی کی اک رمق تو اس کے چہرے پر آتی نہیں دیکھی۔"

دونوں باتیں کر رہے تھے کہ نورینہ اپنے کمرے سے تیار ہو کر نکل آئی۔ اس نے سپید بے داغ ساڑھی پہن رکھی تھی۔ ہاتھ میں چھوٹا سا سپید بیگ تھا۔ چہرہ شگفتہ نہیں تھا...... بہت نڈھال دکھائی دے رہی تھی۔

"کہیں جا رہی ہو؟" ممی نے پوچھا۔

"ہاں ممی......"

"کہاں؟"

"ایئرپورٹ۔"

"کیوں؟"

"میری ایک فرینڈ یو کے جا رہی ہے۔"

نور احمد نے بیٹی کی طرف دیکھا۔

آج جاوید اپنی بچی کے ساتھ واپس آ رہا تھا۔ اس کی بچی بالکل ٹھیک ہو گئی تھی۔ اس کے تینوں دوستوں نے ایئرپورٹ جانے کے لیے نور احمد سے چھٹی لی تھی۔

"کب تک آؤ گی؟" ممی نے پوچھا۔

"کیوں ممی، کوئی کام ہے؟"

"ہاں۔"

"کیا؟"

"زبیدہ آ رہی ہیں آج اور تمہارا چائے پر ہونا ضروری ہے۔"

نورینہ نے ایک دلگرفتہ نگاہ ماں پر ڈالی۔ پھر پھیکی سی مسکراہٹ لبوں پر لاتے ہوئے بولی۔ "اچھا ممی...... آ جاؤں گی۔"

نورینہ باہر آ گئی۔ اپنی گاڑی میں بیٹھی اور ایئرپورٹ کی طرف چل دی۔

کراچی سے آنے والی فلائٹ پندرہ منٹ لیٹ تھی۔ اسی فلائٹ سے جاوید

آ رہا تھا۔ اس کے استقبال کے لیے فاخرہ کے علاوہ بہت سے عزیز اور جاوید کے تینوں دوست آئے ہوئے تھے۔

نورینہ لاؤنج میں آئی۔ اس کی دوست نے یو کے جانا تھا۔ فلائٹ تیار تھی۔ وہ دوست کو خدا حافظ کہہ کر لوٹنے کو تھی کہ اس نے فاخرہ کو دیکھا جو رشتہ داروں میں گھری کھڑی تھی۔

"جاوید آ رہا تھا۔" یہ اندازہ کرتے نورینہ کو دیر نہ لگی۔ کراچی سے آنے والے جہاز کا اعلان ہوا تو اس گروپ میں ہیجانی سی کھلبلی مچ گئی جس میں فاخرہ گھری کھڑی تھی۔ سب باہر جنگلے کی طرف جانے لگے۔

نورینہ آہستہ آہستہ چلتے لاؤنج سے باہر آ گئی اور جہاں گاڑی پارک کی تھی، اس طرف چلی گئی۔

وہ گاڑی کے قریب آ کر رک گئی۔ واپس جانے کی بجائے مسافروں کے اس رستے سے باہر آنے کا انتظار کرنے لگی۔

کافی دیر بعد مسافر آنا شروع ہوئے۔ وہ تھوڑے سے فاصلے پر کھڑی آنے والوں کو دیکھتی رہی۔ کبھی کبھی فاخرہ کو بھی دیکھ لیتی جس کا اضطراب دید کے قابل تھا۔

جاوید بچی کا ہاتھ تھامے نظر آیا۔

نورینہ نے دُور ہی سے اسے پہچان لیا۔ وہ خاصا صحت مند ہو گیا تھا۔ اس کی شخصیت نکھر آئی تھی۔ گلابی پھولے پھولے فراک میں پھول سی بچی اس کے ساتھ آہستہ آہستہ چل رہی تھی۔

ماں اور بچی کے ملنے کا منظر بڑا دلگداز تھا۔ بچی تو ہاتھوں ہاتھ لی گئی۔ جاوید بھی سب ملنے والوں میں گھر گیا۔

سب کتنے خوش تھے۔ ملنے ملانے کا سلسلہ کئی منٹ تک جاری رہا۔ وہ گاڑی کے ساتھ لگی سب کو دیکھتی رہی۔ ان کی خوشی اس کے اندر طمانیت کا احساس بھر رہی تھی۔ اس کی اپنی محرومی بھی پھانس بنی ہوئی تھی لیکن یہ خوشی اس کا انعام تھی۔

وہ گاڑی میں بیٹھنے کو تھی کہ اچانک ہی فاخرہ کی نگاہ اس پر پڑی...... اس نے جاوید کو بازو سے پکڑ کر جھنجھوڑتے ہوئے اس کی طرف اشارہ کیا۔ "جاوید...... وہ...... وہ...... اپنی خاتون......"

"کون......؟"

"سوشل ورکر......"

فاخرہ نے نورینہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بتایا۔ "اسی خاتون نے تو بے بی کے لیے سب کچھ کیا تھا......"

جاوید جیسے پتھرا گیا۔ سب لوگ بچی کو دیکھ رہے تھے۔ بچی سے مل رہے تھے۔ فاخرہ بھی بچی کے بلانے پر اس کی طرف متوجہ ہو گئی۔

نورینہ گاڑی میں بیٹھ کر گاڑی سٹارٹ کر رہی تھی کہ جاوید سب کو چھوڑ کر اس کی طرف لپک کر آیا۔

"نورینہ" اس نے گاڑی کے قریب آ کر کھڑکی کو دونوں ہاتھوں سے مضبوطی سے پکڑ لیا۔ اس کی آواز میں تشکر عقیدت اور احترام کے علاوہ وہ محبت بھی تھی جس میں طلب نہیں ہوتی۔ ملن کی خواہش نہیں ہوتی۔ پا لینے کی خوشی اور بچھڑ جانے کا غم نہیں ہوتا۔

لیکن جو پھر بھی اپنا وجود منواتی ہے۔

اپنے ہونے کا احساس دلاتی ہے۔

"مبارک ہو جاوید۔ بچی ٹھیک ہو گئی......" نورینہ نے کئی لمحوں کے بعد کہا۔ جاوید کی طرف دیکھا اور گاڑی چلا دی۔

"خدا حافظ۔" اس نے کہا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو جھلملا رہے تھے۔

"تم کتنی عظیم ہو نورینہ......" جاوید کے ہونٹوں سے نکلا...... جانے نورینہ نے یہ الفاظ سنے بھی تھے کہ نہیں۔

گاڑی چلی گئی اور وہ دھندلائی آنکھوں سے تیزی سے جاتی گاڑی کو دیکھتا رہ گیا...... اس کے اور نورینہ کے درمیان فاصلہ بڑھتا چلا گیا تھا۔ جاوید کا دل دکھ رہا تھا۔

اداسیاں اس کے اندر اتر رہی تھیں۔

بعض جذبے کتنے نافہم ہوتے ہیں۔

بعض دُکھ کتنے عزیز ہوتے ہیں

اور

بعض چاہتیں کتنی شدید اور بے لوث ہوتی ہیں۔

جاوید

آج سمجھ پایا......

آج

DE KH
MF KA
1/05.